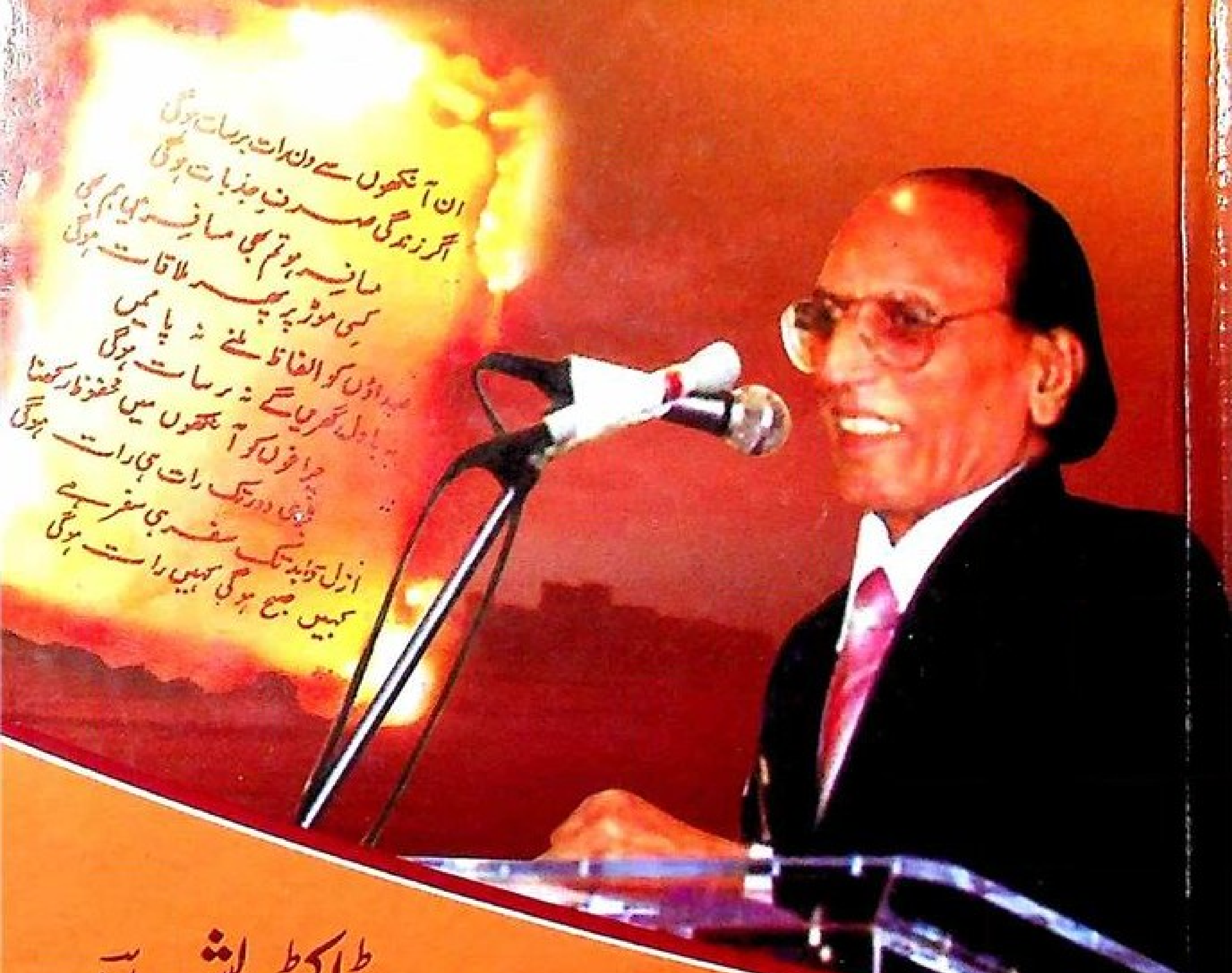
شاعرِ اعظم

کلیاتِ بشیر بدر



ڈاکٹر بشیر بدر

کلیاتِ بشیر بدر

ڈاکٹر بشیر بدر

ترتیب و تزئین

فاروق ارگلی

(سکریٹری عالمی اُردو ٹرسٹ)

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کلیاتِ بشیر بدر

ترتیب و تزئین: فاروق ارگلی

صفحات: 424 سائز: 23x36/16

اشاعت: 2014ء

بہ اہتمام: محمد ناصر خان

KULIYAT-E-BASHEER BADR

by: **Dr. BASHEER BADR**
11, Rehana Colony, Idgah Hills, Bhopal-462003

Compiled by: **FAROOQ ARGALI**

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (PVT.) LTD.

Corp. Off. 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Phones : 011- 23289786, 23289159, Fax: 011-23279998
E-mail : faridexport@gmail.com, Website : www.faridexport.com

OUR BRANCHES

DELHI : FARID BOOK DEPOT (P) Ltd.
422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6, Ph. 011-23256590

MUMBAI: FARID BOOK DEPOT (P) Ltd.
208, Sardar Patel Road, Near Khoja Qabristan, Dongri, Mumbai-400009
Ph. 022-23731786, 23774786

Printed at : Farid Enterprises, Delhi-2

ڈاکٹر راحت بدر صاحبہ

کے

نام

راحت صاحبہ جو اکثر یوں یاد دلاتی ہیں:

اللہ نے نواز دیا ہے تو خوش رہو
تم کیا سمجھ رہے ہو یہ شہرت غزل سے ہے

اعتراف

نفرت کو محبت کا اک شعر سناتا ہوں
میں لال پسی مرچیں پلکوں سے اُٹھاتا ہوں

بشیر بدؔر

ڈاکٹر بشیر بدؔر — ایک نظر میں

نام : سیّد محمد بشیر

تخلّص : بدؔر

والد : سیّد محمد نظیر مرحوم

والدہ : عالیہ بیگم

زوجہ : سیّدہ قمر جہاں شہناز (مرحومہ) زوجہ ثانی: ڈاکٹر راحت بدر

تعلیم : ایم.اے، پی.ایچ.ڈی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

تعلیمی امتیازات:

1. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین کی ادارت
2. ۱۹۶۹ء میں غالب نمبر ترتیب دیا جسے یونیورسٹی نے کتابی صورت میں شائع کیا۔
3. ایم.اے (پریویس) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام مضامین کے ایم.اے (پریویس) کے طلبا میں اوّل رہنے پر سرولیم ماریس اسکالرشپ ملا۔
4. ایم.اے (اُردو) میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن لانے پر یونیورسٹی گولڈ میڈل اور سارے مضامین کے ٹاپرس میں فرسٹ رہنے پر 'رادھا کرشنن پرائز' ملا۔

انعامات : اکائی (غزلوں کا پہلا مجموعہ) پر اُردو اکیڈمی یوپی کا انعام 1969ء

امیج (غزلوں کا دوسرا مجموعہ) پر اُردو اکیڈمی یوپی کا انعام 1973ء

آمد (غزلوں کا تیسرا مجموعہ) پر اُردو اکیڈمی کا انعام 1985ء

آزادی کے بعد اُردو غزل کا تنقیدی مطالعہ پر اُردو اکیڈمی کا انعام 1981ء

بیسویں صدی میں اُردو غزل (تنقید) 1981ء

امتیازِ میر، میر اکیڈمی کا وقاری ایوارڈ 1981ء

تمھارے لیے (غزلوں کا انتخاب، ہندی میں) دو ایڈیشن

سفر : پاکستان، کناڈا، امریکہ، دُبئی، شارجہ، ابوظہبی، بحرین، مسقط، دوہا (قطر)

فرائض و اور امتیازات: :

1. ممبر ساہتیہ اکیڈمی، ہند (دہلی)
2. رکن مجلسِ انتظامیہ اور مجلس عامہ اُردو اکیڈمی لکھنؤ
3. رکن مجلس انتظامیہ اُردو بورڈ (مرکزی حکومت ہند) دہلی
4. صدر، بورڈ آف اسٹڈیز، ریسرچ ڈگری کمیٹی، میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ
5. ایکسپرٹ، انعامی کمیٹی، ہماچل پردیش اکیڈمی
6. ممبر، بورڈ آف اسٹڈیز، کروکشیتر یونیورسٹی
7. چیئرمین مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی

مستقل سکونت: 11، ریحانہ کالونی، عیدگاہ ہلز، بھوپال، مدھیہ پردیش (بھارت)

فہرست

امیج

آمد

آسمان

آس

”آس“ کے بعد کی غزلیں

آج کے سب بچوں کے لیے

سمندر کو سمجھنا ہے تو اُس کی تہہ میں ٹھہلا کر
یہ ساحل ہے یہاں تو مچھلیاں کپڑے بدلتی ہیں

دعاگو

بشیر بدرؔ

□ فاروق ارگلی

آسمانِ غزل کا بدرِ کامل — بشیر بدؔر

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

اپنے شعری سفر کے آغاز میں ہی ایسا لافانی شعر کہنے والے ہمارے عہد کے عظیم شاعر ڈاکٹر بشیر بدؔر کی سحر کار شخصیت، شہرت و مقبولیت کے آسمان پر بدرِ کامل بن کر اپنی تابانیاں بکھیر رہی ہے۔ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے وہ موجودہ دور میں ایسے 'لیونگ لیجنڈ' ہیں جن پر ہندوستان بجاطور پر ناز کرسکتا ہے۔

سید محمد بشیر یعنی ڈاکٹر بشیر بدؔر نے 15 رفروری 1935ء کو کانپور میں، ایک متوسط سادات گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد سید محمد نظیر سرکاری ملازم تھے۔ بشیر اپنی والدہ محترمہ عالیہ بیگم کی آغوش تربیت میں پروان چڑھے۔ سات آٹھ برس کی عمر میں انھوں نے قرآن پاک ختم کرلیا تھا۔ فطری طور پر وہ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھے۔ محمد بشیر سے پہلے ان کے دو بھائی عالمِ طفلی میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ سید محمد نظیر اولاد کی محرومی سے دل گرفتہ ہوکر اپنے روحانی مرشد فتح پور ہسوہ کے خدارسیدہ بزرگ شاہ نجم الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی۔ شاہ صاحب کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے محمد بشیر، محمد ضمیر، محمد صغیر اور محمد اقبال جیسے ہونہار بیٹے عطا فرمائے۔ سید محمد بشیر اپنے تینوں چھوٹے بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین تھے۔ شعر و سخن کا شوق بھی انھیں بچپن سے ہی ہوگیا تھا۔

1949ء میں جب وہ اٹاوہ کے حافظ صدیق انٹر کالج میں ہائی اسکول کے طالب علم تھے، انہی دنوں اٹاوہ میں حضرت سید نامراد شاہؒ کے عرس پر منعقد طرحی مشاعرے میں سیّد محمد بشیر نے غزل پڑھی۔ ایک کم عمر طالب علم کے کلام کی بہت تعریف ہوئی۔ اٹاوہ کے ایک سرکردہ

رئیس اور علم و ادب کی دلدادہ شخصیت نے از راہِ محبت انھیں بدؔر تخلص اختیار کرنے کی تلقین کی اور محمد بشیر، بشیر بدؔر ہو گئے۔

1959ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ نوجوان بشیر بدؔر نے اپنی ریگولر تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے خود کو اپنی والدہ کی خدمت، تین بھائیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ پولیس کے محکمہ میں محرر بنے اور دورانِ ملازمت الہ آباد، لکھیم پور کھیری، سیتاپور اور علی گڑھ میں ان کا قیام رہا، لیکن خانگی ذمہ داریوں اور ملازمت کی مصروفیات کے باوجود پرائیویٹ طور پر تعلیم کا سلسلہ برقرار رہا، یہاں تک کہ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن کے ساتھ ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے 'آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ پہلے وہ علی گڑھ میں لکچرر رہے، اس کے بعد میرٹھ کالج سے وابستہ ہو گئے۔ درس و تدریس کے شعبے میں نمایاں کارکردگی کے ساتھ ساتھ ان کا شعری سفر بھی جاری رہا۔

بشیر بدؔر صاحب کی اہلیہ بیگم شہناز بدر ایک باشعور، عاقلہ اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ ان سے دو بیٹے سید معصوم، سید نصرت اور ایک بیٹی صبا نے جنم لیا۔ اس وقت جبکہ ڈاکٹر بشیر بدؔر کی شاعرانہ شہرت عالمگیر ہو چکی تھی، بیگم شہناز بدر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ بشیر بدر صاحب جیسے حساس انسان کے لیے محبت کرنے والی شریکِ حیات کا انتقال جانکاہ سانحہ تھا۔ ان کی زندگی کا دوسرا بڑا حادثہ اس وقت ہوا، جب میرٹھ کے فرقہ وارانہ فسادات میں شر پسندوں نے ان کا سارا اثاثہ، ان کا گھر بار جلا کر خاک کر دیا۔ بشیر بدؔر صاحب نے بڑی پامردی اور ہمت کے ساتھ حالات کا سامنا کیا اور اپنے کرب اور تکلیفوں کو اپنی شاعری میں سمو کر زندگی کے سفر پر آگے بڑھتے گئے۔ اس دوران انھوں نے بچوں کی شادیاں کیں اور انھیں خود کفیل بنایا۔ پھر زندگی کا ایک موڑ ایسا آیا جہاں انہیں ڈاکٹر راحت صاحبہ کی صورت میں ایک رفیقۂ سفر مل گئیں۔ راحت صاحبہ نے ان کی حیات کا وہ خلا پُر کر دیا، جس نے انھیں بھری پُری دنیا میں تنہا ہونے کے احساس سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ڈاکٹر بشیر بدؔر نے اپنی اہلیہ ثانی محترمہ ڈاکٹر راحت بدؔر سے شادی کے بعد بھوپال میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں آپ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیرمین کے عہدے پر فائز رہے،

لیکن شعروادب کے حوالے سے ساری دنیا ان کی جولانگاہ ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدؔر ہمارے عہد کے ایک ایسے منفرد شاعر ہیں، جنھوں نے اپنے رنگ و آہنگ اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں سے نمایاں شناخت حاصل کی ہے۔ بشیر بدؔر صاحب نے عصری حسیّات، شدتِ جذبات، قوت مشاہدہ، فنی و تخلیقی اجتہاد اور عدیم النظیر جودتِ طبع سے اردو غزل کو اس کی روایتی دلکشی اور کلاسیکی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے جو نیا رنگ روپ اور نیا لہجہ عطا کیا ہے، اس کی مثال اردو غزل کی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ قارئین اور سامعین کی رگِ احساس کو جھنجھنا دینے والی بشیر بدؔر صاحب کی غزل نہ صرف بے پناہ فنی اور فکری خلاقی اور جرأت مندانہ تجربات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے بلکہ وہ روایتی غزلیہ انداز سے یکسر الگ بھی ہوتی ہے۔ ان کی غزل کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ روایتی غزل کے ترنم، تغزل، تقدس اور حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے، اس دور میں زندگی بسر کرنے والے کروڑوں انسانوں کی روحوں کو چھو لینے والا لافانی نغمہ بن جاتی ہے۔ اس طرح اس عہد آفریں شاعر کا فن ایک دریا کی طرح اپنے لیے نیا راستہ بناتا ہوا ذہن و فکر کی بلندیوں سے اتر کر سوادِ جذبۂ احساس میں پھیل کر بحرِ بیکراں بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدؔر نے اپنی غزل میں قدیم فرسودہ موضوعات اور رموز و علائم کے بجائے اپنے سامنے نظر آنے والے، محسوس کیے جانے والے اور عام انسانوں کے جیئے جانے والے سچ کو موضوعِ سخن بنایا، اس اعتبار سے وہ اس عہد کے مجتہد شاعر کہے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اظہار کے لیے نئی لفظیات اور خلاقانہ پیکر تراشی کو وسیلہ بنا کر ایک ایسے جہانِ سخن کی تعمیر کی، جہاں کے وہ بلاشرکتِ غیرے تاجدار بن گئے۔ عام فہم، لیکن تیرِ نیم کش کی طرح سننے اور پڑھنے والوں کی روح میں پیوست ہو جانے والے اشعار تخلیق کر کے ڈاکٹر بشیر بدؔر بلاشبہ دنیائے غزل میں ایک انقلاب کا آغاز بن کر ابھرے؛ جیسا کہ خود ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے:

> ”غزل کا عالمی اور جدید منظر نامہ فارسی زدہ غزل کے طریقۂ کار سے مختلف ہو چلا ہے، یہ کارنامہ میرا ہے۔ میری غزل اس سفر کا آغاز تھی۔“

ڈاکٹر بشیر بدؔر کا یہ دعویٰ، معاصر ناقدوں اور ان کے نکتہ چینوں کی ردّ و قدح کے باوجود ایک مسلمہ سچائی بن چکا ہے۔ اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ دنیائے اردو کے بیشتر معروف

ومقبول شعرا اُن کے رنگ و آہنگ کی تقلید اور اُن کے خرمن فکر کی خوشہ چینی کر رہے ہیں، ایسے لوگ بھی جو عمداً یا حسداً بشیر بدؔر کی تخلیقی عظمت کے بظاہر منکر مگر بباطن معترف ہیں۔

راقم السطور ناقد یا دانشور نہیں مگر اُردو ادب کے ایک عام قاری کی حیثیت سے بشیر بدؔر کو سالہا سال سے سن اور پڑھ کر یہ ادّعا رکھنے میں خود کو حق بجانب تصور کرتا ہے کہ بشیر بدؔر صاحب کا تخلیقی دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں انسانی احساسات کی پوری کائنات سمٹ آئی ہے اور یہ وسعتِ تخلیق انھیں اُن کی خداداد ذہانت، فکری ریاضت، وجدانی مشقت اور غیر معمولی قوتِ مشاہدہ نے عطا کی ہے۔ جس کے طفیل میں بشیر بدؔر نے عروسِ غزل کو ان صدرنگ پھولوں سے سجایا ہے، جو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے کھلائے ہیں۔ بقول بشیر بدؔر:

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مشاعروں میں بے پناہ کامیابی اور شہرت پانے والے بہت سے شعرا جب عمر کی منزلیں طے کر کے ضعیفی یا جسمانی معذوری کے سبب مشاعروں سے غائب ہو جاتے ہیں، تو وہ ذہنوں اور خیالوں سے بھی محو ہو جاتے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں انھیں کوئی نمایاں درجہ نہیں ملتا یا نہیں دیا جاتا، لیکن ڈاکٹر بشیر بدؔر کا شمار اردو کے ان چند شعرا میں ہے جو دنیا بھر میں منعقد ہونے والے مشاعروں کی جان تصور کیے جاتے ہیں اور جن کو سننے کے لیے کروڑوں لوگ بے تاب رہتے ہیں، جن کی شرکت کسی بھی بزمِ شعر و سخن کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ درحقیقت عالمی سطح پر مشاعروں میں گونجنے والی بشیر بدؔر کی مترنم غزلیہ شاعری انسانی زندگی کی ابدی حقیقتوں کی عکاس اور ہمیشہ قائم رہنے والی، علمی، ادبی، لسانی اور تخلیقی خصوصیات سے مالا مال ہے۔ بشیر بدؔر کی شاعری ایک زندہ، متحرک اور فعال شاعری ہے جو مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ مزید متحرک اور عہد آفریں ہوتی جائے گی۔ اس دعوے کے ثبوت میں پیش ہیں بشیر بدؔر صاحب کے چند لافانی اشعار:

میں ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

فضا میں آیتیں مہکی ہوئی ہیں کہیں بچّے تلاوت کر رہے ہیں
ہماری بے بسی کی انتہا ہے کہ ظالم کی حمایت کر رہے ہیں

بس گئی ہے مرے احساس میں یہ کیسی مہک کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے
اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا مدتوں بعد مری آنکھوں میں آنسو آئے

سب مغل دربار کی پوشاک پہنے ہیں فقیر شعر کی تنقید قبروں کی تجارت سی لگی
وہ بڑی سی کار سے اتری سیاست کی طرح اک طوائف آج مجھ کو اپنی شہرت سی لگی
میؔر صاحب کی پرانی جوتیاں سر پر رکھیں یہ قدامت آج کے لوگوں کو جدت سی لگے
روٹیاں کچی پکیں کپڑے بہت گندے دُھلے مجھ کو پاکستان کی اس میں شرارت سی لگی

میں چاند کا خیال تھا تاروں کا خواب تھا کس نے مجھے چراغ بنا کر بجھا دیا

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

دشمنی کا سفر اک قدم، دو قدم تم بھی تھک جاؤ گے، ہم بھی تھک جائیں گے

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشا ہے جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

مسافر ہیں ہم بھی مسافر ہو تم بھی کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے جب کبھی ہم دوست بن جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

دنیا بھر کے شہروں کا کلچر یکساں آبادی تنہائی بنتی جاتی ہے

کیوں حویلی کے اُجڑنے کا مجھے افسوس ہو سیکڑوں بے گھر پرندوں کے ٹھکانے ہو گئے

ملک تقسیم ہوئے، دل تو سلامت ہے ابھی کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں

مختصر باتیں کرو بیجا وضاحت مت کرو یہ نئی دنیا ہے بچوں میں ذہانت ہے بہت

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا جہاں دریا سمندر میں ملا دریا نہیں رہتا

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

کس نے جلائیں بستیاں بازار کیوں لٹے میں چاند پر گیا تھا مجھے کچھ پتہ نہیں

کبھی کبھی تو چھلک پڑتی ہیں یوں ہی آنکھیں اداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا

ہم پہلے نرم پتوں کی اک شاخ تھے مگر کاٹے گئے ہیں اتنے کہ تلوار ہو گئے

میں شاہراہ نہیں راستے کا پتھر ہوں یہاں سوار بھی پیدل اتر کے چلتے ہیں

OO

□ پروفیسر قمر رئیس

بشیر بدؔر کی غزل کا آہنگ

گزشتہ رُبع صدی میں اُردو غزل کے میدان میں جس تنوع اور توانائی کے آثار پیدا ہوئے ہیں اور 'آزاد غزل' کے عجوبہ سے قطع نظر غزل کی شاعری میں داخلی اور خارجی سطح پر جو مستحکم تجربے ہوئے ہیں ان کے سنجیدہ مطالعہ کی طرف ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی ہے۔نئی غزل کے تناظرات کو بدلنے میں اس مدت میں بشیر بدؔر کی تخلیقی کاوشوں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ تاہم یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بشیر بدؔر کی غزل گوئی پر چند تاثراتی اور تحسینی مضامین تو ضرور لکھے گئے لیکن کسی اہم نقاد نے علمی ڈھنگ سے ان کی غزل کا مطالعہ نہیں کیا۔ دوسری جانب ان کے بارے میں معاندانہ تنقید کی مثالیں بھی ملتی ہیں، جس کا نمونہ 'اندازے' الٰہ آباد کے شمارہ نمبر 2 میں 'آمد' پر تبصرہ ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ بشیر بدؔر کی صحیح قدر شناسی میں خود بشیر بدؔر کے ادعائی بیانات اور رویئے بھی دخیل رہے ہیں۔ اُردو کے قاری اور شاید ناقد بھی مقطع میں شاعر کی تعلّی آمیز سخن گسترانہ باتوں کو جس خوش دِلی سے گوارا کر لیتے ہیں، نثر میں شاعر کی خودستائی انھیں اتنی ہی ناگوار خاطر ہوتی ہے اور وہ اسے شاعر کی عامیانہ رعونت سمجھ کر بدک جاتے ہیں (حالانکہ اس صورتِ حال کا مطالعہ بھی ہمدردی اور معروضیت سے کیا جانا چاہیے) اتفاق سے ڈاکٹر بشیر بدؔر جدید شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید غزل کے نقّاد بھی ہیں۔ 1972ء میں جب انھوں نے آزادی کے بعد کی غزل پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تو ان کے دو شعری مجموعے 'اِکائی' اور امیج مکمل ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی چار سو صفحات کی اس کتاب میں انھوں نے چار جملے بھی اپنی مدح میں تحریر نہیں کیے۔ البتہ مثالوں میں اپنے اشعار ضرور نقل کیے ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''دراصل 1972ء میں ایک سچ کی طرح میں نے اس مطالعہ کو اپنی شخصیت کے وسیلے سے جنم دیا تھا۔ میں مطمئن ہوں کہ جب میں اینٹی غزل خود بھی لکھ رہا تھا اس وقت بھی اس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی اور اسے ادبی ہزل سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔'' (ص13)

ان کا تیسرا مجموعہ 'آمد' 1985ء میں شائع ہوا، جس میں اپنے 2035ء کے قارئین کے نام انھوں نے ایک خط شائع کیا ہے۔ اس خط میں بلاشبہ انھوں نے اپنی شاعری اور اپنی مقبولیت وشہرت کا ذکر مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''آج 1985ء کی غزل میں مجھ سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں۔ ہندوستان کی 75 کروڑ آبادی، پاکستان کے اُدبی مراکز، مغرب میں ٹورنٹو، شکاگو، نیویارک اور لندن کے ادبی حلقوں میں کتنے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں اس کا اندازہ لگانا دُشوار ہے۔''

پھر وہ اس غیر معمولی مقبولیت کا سبب بھی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

''یہ مقبولیت میری نہیں بلکہ جدید وسائل (ریڈیو۔ٹی وی وغیرہ) کی ہے۔''

یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن ان کے اندر بیٹھا غزل کا نقّاد خود ان کی غزل گوئی اور اس کے حلقۂ اثر کا جائزہ بھی لینے لگتا ہے اور اپنی نگاہِ تخیل سے یہ دیکھ لیتا ہے کہ نصف صدی بعد برصغیر میں جو غزل لکھی جائے گی وہ اسی کے اسلوب اور لہجہ کی آئینہ دار ہوگی۔ لکھتے ہیں:

- ''آج غزل کے کروڑوں عاشقوں کا یہ خیال ہے کہ میری ناچیز غزل اُردو غزل کے کئی سو سالہ سفر میں نیا موڑ ہے۔''
- ''میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن چکا ہے۔ تنقید کی بددیانتی اور نافہمی کے اکثر حربے اپنے آپ میں محدود ہوگئے ہیں۔ آج میرا اسلوب غزل کا محبوب اسلوب بن گیا ہے۔''
- ''میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے عہد میں (یعنی 2035ء میں) جو غزل رواں دواں ہے اس کا آغاز مجھ ناچیز کے چراغوں سے ہوا۔''

آخری بیان تو مستقبل کی پیش گوئی ہے جسے نظر انداز کیا جانا چاہیے کہ ہر شاعر غالبؔ نہیں ہوتا۔ جہاں تک پہلے بیان کا تعلق ہے اگر واقعی یہ شاعر کی نہیں بلکہ کروڑوں عاشقوں کی رائے ہے تو اس سے ہر اُردو داں کو آشنا ہونا چاہیے، خواہ مخواہ اس کو دُہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دراصل دوسرا بیان اس غیر ضروری خودستائی کے پیچھے کارفرما شاعر کی مجروح انا کی جھنجھلاہٹ اور تلخی کی غمازی کرتا ہے۔ اسے اصل شکایت اپنے لاکھوں قدر شناسوں سے نہیں بلکہ چند نقادوں سے ہے جو اس کے پرستاروں کے ہم خیال ہو کر اس کے اسلوبِ شعری کی داد نہیں دے رہے ہیں اور نہ ہی شاعر کے اس مقبولِ عام اسلوب کو اس عہد کی غزل کا اسلوب قرار دے رہے ہیں۔

یہ سوال الگ ہے کہ یہ شاعر کا زعم باطل ہے یا اس میں سچائی بھی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ بشیر بدؔر جیسا شائستہ، منکسر المزاج اور مشرقی تہذیب کا پروردہ شخص جو بارہ پندرہ برس پہلے تک اپنی شاعری کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا اور اپنے تجربات کو اینٹی ہزل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اچانک ایسی جارحانہ خودستائی پر کیوں اُتر آیا؟ اس کا جواب گزشتہ پندرہ سال میں مشاعرہ میں ان کی بے پناہ ڈرامائی مقبولیت میں ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مشاعروں میں اپنی روز افزوں مقبولیت سے وہ کس درجہ متاثر ہوئے اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس اثر پذیری نے ان کی شاعری کی زبان، اسلوب اور لہجہ کو بدل کر رکھ دیا۔ 'آمد' اور بڑی حد تک 'امیج' کی غزلیں فارسی ترکیبوں، اضافتوں اور اظہارات سے پاک ہیں۔ میری دانست میں یہ مشاعروں میں (جن کے سامعین کی غالب اکثریت غیر اُردو داں حضرات پر مشتمل ہوتی ہے) ان کی غیر مشروط پذیرائی کا سبب کم نتیجہ زیادہ ہے۔ ورنہ 1970ء سے قبل کی ان کی غزلوں کے پہلے مجموعے 'اکائی' کے بے شمار اشعار فارسی ترکیبوں سے بوجھل نظر آتے ہیں۔ بشیر بدؔر 'آمد' میں لکھتے ہیں:

"اب غزل کا عالمی اور جدید منظر نامہ فارسی زدہ اُردو غزل کے طریقۂ کار اور منظر نامہ سے مختلف ہو چلا ہے۔ یہ کارنامہ میرا ہے کہ میری غزل اس سفر کا آغاز تھی۔"

"آج غزل کا مسئلہ کیا ہے؟ غزل کروڑوں دِلوں پر راج کر رہی ہے۔ پڑھنے

والے سوالاکھ ہیں تو غزل کے سننے والے مختلف وسیلوں سے کروڑوں میں ہیں۔ یہ کروڑوں عاشقانِ غزل ہمارے ذہین نقادوں کی نگاہ میں اس لیے نامعتبر ہیں کہ یہ فارسی غزل کی اترن لفظیات اور استعارات سے ناواقف ہیں، ان کے مقابلہ میں میرا خیال ہے کہ یہ زندگی کے ذہین لوگ ہیں جوان الفاظ اور مردہ تراکیب سے بے خبر ہیں جن سے انھیں ناواقف ہونا چاہیے۔''

بشیر بدؔر کا یہ دعویٰ تو صحیح ہے کہ انھوں نے اپنی دوسرے دَور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں سے عاری، بول چال کی سادہ رواں اور عام فہم زبان میں غزل کہی ہے اور یہ ان کے منفرد اسلوب کا روشن پہلو ہے لیکن ان کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ یہی اس عہد کا 'طرزِ بیاں' ٹھہرا۔ شاید اس نتیجہ تک وہ اس لیے پہنچے کہ پچھلے پندرہ سال میں وہ مشاعروں میں ایسی غزلیں کثرت سے سنتے آئے ہیں جو لفظیات کے اعتبار سے ان کی غزل سے مشابہ ہوتی ہیں اور جن کی تفہیم کم خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کے لیے آسان ہوتی ہے۔ اسی طرح غزل کی فارسی آمیز زبان اور غزل کے روایتی رموز وعلائم کے تئیں ان کا تحقیر آمیز رویہ بھی کسی مغالطہ پر مشتمل ہے۔

ہم عصر غزل میں تخلیقی اظہار کسی ایک اسلوب کا پابند نہیں اور نہ ہی نئی غزل، غزل کے روایتی علامتی اظہارات سے عاری ہے۔ فراؔق اور فیضؔ کے بعد کی غزل میں بھی مجروؔح، حسن نعیؔم، احمد فراؔز، بانؔی، پروین شاکرؔ، شہریاؔر سب ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ ایسے نوجوان شاعر تو ہیں جو مشاعروں میں بشیر بدؔر کی بے پناہ مقبولیت سے رشک وحسد کرتے ہیں اور ان کی نقل کرتے ہیں، لیکن شاید ایسا کوئی اہم شاعر نہیں جو بشیر بدؔر کا پیرو ہو۔ ان کے رنگ سخن سے متاثر ہو[1]۔

---

[1] ''اب جدید گوان کی (بشیر بدؔر) کی تقلید کر رہے ہیں۔'' (وحید اختر)

''فی زمانہ جدید تر غزل گوان کی تقلید کر رہے ہیں۔ ہندوپاک کی جدید تر غزلیہ شاعری پر ان کے جلی اور خفی اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ لوگ باگ ان سے نیا غزلیہ فیض وعرفان حاصل کر رہے ہیں۔ آج ان کا دلاویز اسلوب غزل کا محبوب اسلوب بن گیا ہے۔'' (نظام صدیقی)

''ایک محتاط اور ذمہ دار سروے کے مطابق بشیر بدؔر کی صرف ایک غزل جس کی ردیف 'بابا' ہے، اس سے متاثر ہو کر رسالے اور مشاعرے کے اہم شعراء نے ڈھائی ہزار غزلیں کہیں۔ 71 شاعروں نے اپنی غزلیں شائع کراتے وقت ایسی غزلوں کو بشیر بدر کے نام معنون ومنسوب کیا۔'' (رضیہ حامد)

بشیر بدؔر جیسی تخلیقی صلاحیت کے شاعر نے اپنی شاعری کی قدر و قیمت کو مشاعروں کی پُرفریب شہرت سے وابستہ کر کے یقیناً غلطی کی ہے۔ اس حقیقت کا احساس انھیں اس وقت ہوگا جب وہ مشاعروں کے محبوب شاعر نہیں رہیں گے اور ان کی جگہ دوسرے لے لیں گے۔ لیکن جدید شاعری کے ناقدین بھی ان کی شاعری کو نظر انداز کر کے کچھ ایسی ہی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ بشیر بدؔر کی غزل سے تعصب اور تفریق کا سلوک کرنا نئی غزل کے ساتھ صریحاً بے انصافی کرنا ہے۔ بشیر بدؔر ہم عصر غزل کے نمائندہ شاعر ہی نہیں اس کی مقبولیت اور رفعت کے ایک اہم معمار بھی ہیں۔ جدید تر غزل میں ان کی آواز اپنے گونا گوں شعری محاسن کے لحاظ سے ایک پہچان رکھتی ہے۔

ساتویں دہے میں جدیدیت کے پہلے بڑے حملے میں اُردو کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی اکثریت ایسی تھی جو مقاومت نہ کر سکی۔ کچھ تو شہید ہو گئے کچھ مجروحین کی صف میں دیکھے گئے۔ بشیر بدؔر کی اس دَور کی شاعری میں جراحتوں کے نشانات گنے جا سکتے ہیں۔ یوں بھی اس خیال سے کچھ حیرت ہوتی ہے کہ یوپی کے چھوٹے اور نیم پسماندہ شہروں میں زندگی بسر کرنے والا شاعر اتنا 'جدید' کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نظم نہیں غزل کے روایت گزیدہ فارم میں چونکا دینے والے تجربے کرنے پر قادر ہو جائے۔ لیکن جب یہ دیکھتے ہیں کہ اِن جرأت آزما تجربوں کے باوجود انھوں نے نہ تو کبھی غزل کی صنفی حرمت پر آنچ آنے دی، نہ اس کے آداب سے کھلواڑ کیا (دو چار ٹیڈی یا ٹیڑھی غزلیں استثنائی ہیں) نہ ہی فیشن زدہ تنہائی، بے چہرگی اور بے گانگی جیسے مجہول تصورات سے اسے داغدار بنایا تو یقین ہو جاتا ہے کہ 'جدیدیت' کی شکست و ریخت نے انھیں فائدہ ہی پہنچایا۔ کم از کم روایتی غزل کے بندھے ٹکے رُوپ اور تخئیلی سانچوں سے انھیں آزاد اور منحرف کر دیا۔ آگے کا سفر انھوں نے اپنے تخلیقی وجدان، اعتماد اور خود آگہی کے سہارے طے کیا۔ یوں بھی 1969ء کے 'اِکائی' کے نوٹس میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ:

> ''جو لوگ جدیدیت کو طے شدہ اجتماعی نظریات کی تحریک سمجھتے ہیں اس (جدیدیت) سے میری اور میری شاعری کی واقفیت تک نہیں۔''

یہیں انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ:

"عملی طور پر میرا نظریہ زندگی اور نظریہ شاعری ذرا بھی طے شدہ نہیں...... میرے یہاں ہر شعر اپنا نظریہ شعری اپنے ساتھ لے کر وجود میں آتا ہے۔"

آخر کے دونوں بیان بے حد مبالغہ آمیز ہیں۔ فکر و نظر رکھنے والے ہر تخلیقی کار کا ایک نظریہ زندگی اور نظریہ فن ضرور ہوتا ہے جو نمو پذیر رہتا ہے اور جس کی روشنی میں اس کی فنکارانہ شخصیت نمو پاتی ہے۔ لیکن اپنے اس تصوّر پر اعتقاد نے بشیر بدؔر کی شاعری کو متاثر ضرور کیا ہے، اور وہ یہ کہ اپنے ہر سچے شعری تجربہ کو وہ بہ تمام وکمال ایک تخلیقی وحدت بنانے پر زور دیتے ہیں۔ اس تخلیقی رویّے نے بشیر بدؔر سے تیر و نشتر جیسے خوبصورت شعر کہلوائے ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ بشیر بدؔر کی شناخت ان خوبصورت اور مفرد شعروں سے زیادہ ہونے لگی اور ان کی شاعری سے کم۔ دوسرے یہ کہ ان کی شاعری میں فکری ارتقا کے نقوش کم نما رہے (اس کے اسباب دوسرے بھی ہیں) اس کے نتیجہ میں وہ منفرد آب و رنگ جو ان کی تہہ دار شخصیت کی آبیاری میں ان کی غزل میں رچ رہا تھا زیادہ روشن نہ ہو سکا۔ تاہم قریب سے دیکھنے پر اس کے عناصر کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہے۔

بشیر بدؔر کی غزل میں ابتدا سے جو نیا پن ملتا ہے اسے کوئی نام دینا آسان نہیں ہے۔ البتہ ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی غزل آپ بیتی سے عبارت ہے۔ انھوں نے روایتی مضامین یا 'عظیم موضوعات' کا مستعار لبادہ اپنی غزل کو نہیں پہنایا۔ اسی طرح جدیدیت اور وجودیت کے مروّجہ تصوّرات سے بھی دامن بچایا ہے۔ اپنے جذبہ اور احساس کی آہٹوں کو انھوں نے تخیل کی نگہداری میں اس طرح سمیٹا ہے کہ ان کی غزل میں پیکروں کا جلترنگ سا سنائی دیتا ہے۔

پیکر آفرینی یوں بھی مشکل آرٹ ہے جو ہر ایک کو ودیعت نہیں ہوتا۔ بعض اچھے شاعر بھی کوشش کے باوجود پیکر تراشی کے فن سے بہرہ ور نہیں ہو پاتے۔ پھر نازک ہونٹوں جیسے غزل کے دو مصرعوں میں کسی منظر کا متحرک نقش اس طرح اُبھارنا کہ اس کے فطری رنگ قائم رہیں اور وہ ایک جمالیاتی تجربہ بن جائے بے حد دشوار عمل ہے۔ اس لیے بھی کہ اس نوع کی تصویر کشی میں الفاظ صرف رنگوں اور لکیروں کا کام انجام نہیں دیتے وہ اسے استعارہ یا تمثیل بنا کر معنوی تلازمات کے لیے دائرے بھی بناتے ہیں۔ وہ شاعر کے ایک سے زیادہ یا مخلوط

مشاہدات اور تجربات کو Condense شکل میں ادا کرنے کی قوت جگاتے ہیں اور اپنے صوتی آہنگ سے بھی ایک ایسی فضا خلق کرتے ہیں جو قاری کو شعری تجربہ کی اسراریت یا ندرت کا ادراک بخشتی ہے۔

شعر میں لفظی پیکروں کو اہمیت دینے والی جدید شاعری میں دو رویّے واضح نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو شاعر کی نجی داخلی کائنات کو نجی علامتوں کے ذریعے پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے اور دوسرا وہ جو شاعر کے داخلی تجربات اور حسّیات کو خارجی حقائق کا عکس جانتا اور شعر میں ان کا اظہار خارجی حوالوں سے کرتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے رویّے میں شعر کی معنوی ترسیل کا امکان زیادہ قوی ہوتا ہے۔ یہ رویّہ اُردو غزل کی روایت سے میل بھی کھاتا ہے۔ بشیر بدؔر کی غزل میں بھی اسی رویّے کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ اس نازک رشتہ سے ان کی غزل کلاسیکی غزل کی روایت سے جڑ جاتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ استعاراتی اور تمثیلی اظہار سے مناسبت کے باوجود وہ تشبیہ سے منحرف نہیں ہوتے اور اس سے پیکر آفرینی کا کام لیتے ہیں، لیکن ان کے اشعار میں محسوس ہوتا ہے کہ تجربہ کی تازگی نے از خود موزوں تشبیہات تلاش کر لی ہیں۔ ایسی تشبیہات جو دوسرے شعرا کے یہاں نایاب ہیں:

باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیے
کمرے میں نرم نرم اُجالا سا بھر گیا

دُکھ بھرا پیار، سمندر کی طرح لامحدود
غمزدہ حسن رواں پانی میں گھلتا سونا

رات کی بھیگی بھیگی چھتوں کی طرح
میری پلکوں پہ تھوڑی نمی رہ گئی

روایت سے اس تعلق کے باوجود جس کا ذکر آیا، بشیر بدؔر کی غزل کا مجموعی آہنگ Unconventional ہے۔ اس طرح کہ محبوب کا حسن ہو یا دوسرے مظاہرِ کائنات ان کا احساس و ادراک Perception ماقبل کے شاعروں اور معاصرین — دونوں سے جدا، دونوں سے الگ ہے۔ حقائقِ حیات تو

ایک ہی ہوتے ہیں لیکن ان کا احساس وادراک Perception ہر ایک کے یہاں جداگانہ ہوتا ہے۔ تخلیقی فنکار کے یہاں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے حقیقتوں کا ادراک کیسے کس سطح سے اور کس لمحے میں کیا ہے۔ اس کی Orginality اُپج اور خلاّقی کی آزمائش اس میں ہوتی ہے کہ اس نے فطرت، انسانی سماج اور فرد کے باہمی رشتوں اور رموز کا عرفان کیونکر حاصل کیا ہے۔ فطرت اور انسانیت کی کن اداؤں میں اس نے شیوۂ حسن تلاش کیا ہے اور انسانی تجربہ کو جمالیاتی تجربہ میں ڈھالا ہے۔

بشیر بدؔر کے یہاں تخلیقی عمل کا یہ رویہ آزاد اور غیر رسمی بھی ہے اور منفرد بھی۔ اس کی انفرادیت کے کئی پہلو ہیں، لیکن اس کی شناخت ان کے پیکروں کے تنوّع اور ترجیحات میں زیادہ آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ اسی میں ان کی شخصیت اور شعورِ حیات کے پنہاں گوشوں کا انعکاس بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی غزل میں رات کا پیکر بے حد نمایاں ہوکر بہ تکرار سامنے آتا ہے۔ لگتا ہے کہ شاعر کی باطنی اُداسی اور محزونی سے رات کا گہرا رشتہ ہے۔ اس کے تخیل میں رات کی پُراسرار ادائیں مستقل جگہ رکھتی ہیں، لیکن یہ رات اکثر اپنے جلو میں خنک چاندنی اور جھلملاتے تارے بھی لے کر آتی ہے۔ یہ رات نیند کے ایسے گاؤں بساتی ہے جو خوابوں سے معمور ہیں۔ یہ رات اپنی حزن آگیں لیکن رومان انگیز فضا سے جذبات کی لہریں اٹھاتی ہے:

رات بھیگی تو تھکے شہر کو یاد آنے لگے
نیند کے گاؤں جو آباد ہیں پلکوں کے تلے

بوجھل اُداس رات تھی دونوں دِلوں کے بیچ
ہم مسکرادیے تو اُجالے برس پڑے

برف کے پھولوں سے روشن ہوئی تاریک زمیں
رات کی شاخ سے جیسے مہ و اختر برسے

پیچھے پیچھے رات تھی تاروں کا اِک لشکر لیے
ریل کی پٹری پہ سورج چل رہا تھا رات کو

سرخ سنہرا صافہ باندھے شہزادہ گھوڑے سے اُترا
کالے غار سے کمبل اوڑھے جوگی نکلا رات ہوئی

یاد جب گھر کی کبھی آتی ہے تو لگتا ہے
رات کی راہ میں شیشے کا مکاں روشن ہے

تھوڑی دیر میں ایک چراغوں کی تھالی
کالی بلّی سر پر رکھ کر آئے گی

ان لفظی پیکروں میں رات کی پُر اسرار تاریکی ایک سخت اور سنگین حقیقت ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو چاند تاروں کے لشکر بھی ہیں۔ آرزو اور اُمید کی کرنیں، اُداسی اور اندھیرے کا سینہ چیر دیتی ہیں۔ شاعر کو اس سچائی پر اعتماد ہے کہ:

شام کے پیڑ کی سُرمئی شاخ پر پتّیوں میں چھپا کوئی جگنو بھی ہے

ایک حقیر کیڑا صرف اس لیے جگنو بن جاتا ہے کہ وہ روشنی کا پیغامبر ہے۔ یہ رجائی رویّہ بھی بشیر بدؔر کو دوسرے جدید شعرا سے ممتاز بناتا ہے۔ روشنی کی یہی جستجو انھیں اجلی دُھوپ کے روشن پیکروں کے قریب لے آتی ہے۔ دُھوپ کے پیکر بڑی کثرت سے ان کی غزل میں ڈوبتے اور اُبھرتے ہیں۔ یہ دُھوپ روشنی اور زندگی کی بشارت ہے۔ تابنا کی، روئیدگی اور شادابی کی علامت ہے، جبکہ دوسرے جدید شعرا کے یہاں دُھوپ اکثر زندگی کی سختیوں کی علامت بن جاتی ہے۔

صبح بستر سے اُٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
دُھوپ کی آہٹ پہ چونک اُٹھے ہیں مندر کے کلس

آنکھوں میں مسکرائی ہوئی نرم دُھوپ سے
کس طرح سرد برف کے پتھر پگھل گئے

میں یہ سمجھا کہ لوٹ آئے تم   دُھوپ کل اتنی اُجلی اُجلی تھی

دُھوپ کا ہرا بجرا آگ کے سمندر میں چل پڑا ہمیں لینے
نرم وگرم ہونٹوں سے بند ہوتی پلکوں پر تتلیوں کے پر رکھ دو

دُھوپ آتی ہے مجھ کو پھیلانے   شامیانہ مِرا ہَوا تانے

یوں تو بشیر بدرؔ کی غزل میں محاکاتی حسن رکھنے والے بے شمار پیکر اُبھرتے ہیں، لیکن ایسے لفظی پیکر جو بار بار آتے ہیں اور اپنی رمزیت سے معنویت کے نئے دائرے بناتے اور قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ برف، ہوا، دریا، سبز رنگ، صبح وشام، گھریلو زندگی اور گاؤں کے پیکر ہیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ یہ کام دوسرے جدید ناقدین مجھ سے بہتر انجام دیں گے۔ تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ بشیر بدرؔ کی غزل سے پہلے اُردو غزل میں گاؤں داخل نہیں ہوا تھا۔ بشیر بدرؔ نے اپنی غزل میں گاؤں کی معصوم سیدھی سادی اور حیات پرور زندگی کی تصویریں دِکھائی ہیں، یہ ان کی خاص دین ہے۔ وہ بعض دوسرے جدید شعرا کی طرح شہروں کی صنعتی زندگی کے آشوب سے گھبرا کر گاؤں اور جنگل میں پناہ نہیں لیتے کہ یہ بھی ایک منفی رویہ ہے۔ گاؤں کے گرد پھیلی فطرت کے نرم آغوش میں معصوم اور جیالے انسانوں کی سادگی اور خوبصورتی کے دلکشا منظر انھیں یاد آتے ہیں اور ان کے قلب ونظر کو آسودگی بخشتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو انسان کو زندگی کرنے کی قوت دیتا ہے:

دُھوپ میں کھیت گنگنانے لگے
جب کوئی گاؤں کی جیالی ہنسی

دُھوپ کھیتوں میں اُتر کر زعفرانی ہوگئی
سُرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہوگئی

سردیوں کی راتوں میں اپنے گاؤں میں گرد الاؤ کے بیٹھے
ہم سے کتنے دیوانے، تیرے میرے قصوں میں اپنا غم سناتے ہیں

گاؤں کی کوئی گوری توڑ کر ہر اِک ناطہ دُور دیس جاتی ہے
اُن گھنے درختوں میں آج دف نہیں بجتے کھیت سر جھکائے ہیں

اس پہاڑی علاقہ میں اِک گاؤں کے موڑ پر آتی جاتی بسوں کے لیے
دو درختوں کی مشفق گھنی چھاؤں میں گرم چائے کی مانوس خوشبو بھی ہے

آخر شعر کی طویل مترنم بحر بشیر بدؔر کی پسندیدہ بحر ہے۔ فاعلن کے سولہ ارکان پر مشتمل یہ متدارک بحر جزئیات نگاری کا امکان بھی رکھتی ہے۔ بشیر بدؔر نے بے شمار غزلوں میں اس کی موسیقی اور وسعت سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن بعد میں اس بحر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

بشیر بدؔر کی غزل کا ایک اور پہلو اس کی نازک ڈرامائی کیفیت ہے، جو طویل بحر کے علاوہ دوسرے اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار محض ایک واردات نہیں، ایک کہانی کا انکشاف کرتے ہیں۔ شاعر شعر کے دروبست میں چپکے سے کوئی سرگزشت، کوئی حکایت سنا کر الگ ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں ڈرامائی کشمکش بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اکثر اس پر استعارے یا علامت کی باریک نقاب پڑی رہتی ہے۔ واقعاتی فضا رکھنے والے اس طرح کے متحرک شعری پیکر بشیر بدؔر کی غزل کا خاص اسلوب بن گئے ہیں:

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے
کوئی کہتا ہے بچالو، میں ابھی زندہ ہوں

سنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

بکھرے شیشوں پہ گر کے ٹوٹ گئے
نیند میں ننگے پاؤں چلتے خواب

کل شام عجب ہوا تھی بجھتے دیے کی لَو میں
وہ آنسوؤں کا کاغذ ہم نے جلا دیا ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

مزید اشعار نقل کیے جاسکتے ہیں۔ اس نوع کے اشعار میں جو حزن و درد ہے وہ ذاتی بھی ہے اور اس کا رشتہ اس عہد کے آشوب و ابتلا سے بھی گہرا ہے۔ ذاتی محرومیاں جب تک اجتماعی دُکھ درد کے احساس سے ہم آہنگ ہو کر انسان محرومیوں کے کرب میں نہ ڈھلیں تاثر آفریں شعر کا قالب اختیار نہیں کرتیں۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ بشیر بدؔر زندگی کے مہتم بالشان موضوعات یا جلتے ہوئے مسائل پر قلم نہیں اٹھاتے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ مسائل ان کی روح میں ہلچل نہ مچاتے ہوں۔ ظالمانہ اونچ نیچ، ہمہ گیر تشدّد، عالمی جنگ کے بھیانک بادل اور صنعتی زندگی کے بھاری قدموں تلے انسانی جذبوں کی پامالی ایسے حقائق ہیں جو ان کا دل بھی لہو کرتے ہیں۔ اس دردمندانہ احساس کی گواہی بہت سے اشعار میں ملتی ہے:

غبارہ پھٹ رہا ہے ہواؤں کے زور سے
دُنیا کو اپنی موت کا اب انتظار ہے

سر پر کھڑے ہیں چاند ستارے بہت مگر
انسان کا جو بوجھ اٹھا لے زمین ہے

دُنیا کے بدصورت حصّے ڈھک جاتے
اپنے پاس کوئی ایسی چادر ہوتی

میں تمام تارے اُٹھا اُٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دیں مرے ہات میں

مرا کیا کہیں بھی چلا جاؤں گا
مگر راستہ تو بنا جاؤں گا

بشیر بدؔر کی دردمندی اور انسان دوستی کی طرف اشارہ میں نے اس لیے کیا کہ عام طور پر انھیں رومانی احساس وتخیل کا شاعر سمجھا جاتا ہے اور اس میں خاصی صداقت بھی ہے۔ وہ جن رموز واشارات سے کام لیتے ہیں وہ نازک اور لطیف ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی دُھند میں لپٹے ہوتے ہیں۔ اس کے باوصف یہ بات حیرت کا باعث ہے کہ بشیر بدؔر نے گذشتہ دو دَہوں میں نئی غزل کو جو ڈِکشن دیا ہے وہ عام بول چال کی مانوس زبان سے ماخوذ ہے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب ان کے تجربات روزمرہ کی، گھر باہر کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ عام انسانوں کی سطح پر جینے کا ہنر جانتے ہوں۔ اس سلسلہ میں بشیر بدؔر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل کے پیکر میں ایسے بے شمار الفاظ تخلیقی حسن کے ساتھ داخل کر دیے جن کو غزل نے اس سے قبل شرفِ قبولیت نہیں بخشا تھا۔ آزاد لکھنوی نے 'سریلی بانسری' میں اضافتوں کی سادہ اور سلیس زبان کے استعمال کا جو تجربہ کیا تھا وہ بے حد شعوری تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کلاسیکی غزل کی مانوس فضا سے بہت کم انحراف کر سکے۔ اس لیے ان کی ٹھیٹھ زبان تخیل اور حقیقت کے ان امکانات کا سراغ نہیں لگا سکی جہاں بشیر بدؔر نے رسائی حاصل کی۔

بدلتی ہوئی ہم عصر زندگی اور حسیت کی ترجمانی کرنے والے نئے الفاظ کا استعمال نئی غزل کا ایک رجحان رہا ہے۔ اس کا اعتراف بشیر بدؔر نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ غزل میں نئے الفاظ کو برتنے کا کام تخلیقی بصیرت کا تقاضہ کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی زبان میں جو لفظ شاعرانہ سیاق وسباق میں استعمال نہ ہوا ہو اس کا پہلی بار شاعرانہ اور تخلیقی استعمال معمولی کام نہیں ہے۔ ورنہ وہ الفاظ جو نئی زندگی کا چلن ہوتے ہیں ان میں نئی زندگی کی تہہ داریوں اور رمزیت کو پیش کرنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ نئے الفاظ کے نئے مزاج کو پہچاننا اور ان سے پورا کام لے لینا شاعرانہ قوت اور فنکاری کی دلیل ہے۔ لیکن اس میں شاعری کے ناشاعری اور منظوم نثر ہوجانے کا خطرہ رہتا ہے اور یہ کام کمزور تخیل اور انفرادیت سے عاری تقلیدی شعرا کے بس کا نہیں ہے۔''

(آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، ص302)

یہاں بشیر بدؔر نے جو باتیں اٹھائی ہیں ان میں سچائی ہے۔ خود انھوں نے نئے الفاظ کے استعمال میں احتیاط اور تخلیقی بصیرت سے کام لیا ہے۔ دوسرے جدید شعرا مثلاً ظفر اقبال کے مقابلہ میں ان کی کوششیں زیادہ کامیاب اور قابلِ داد ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے بول چال کی ٹھیٹھ اُردو کو اپنایا ہے۔ روزمرّہ یا بول چال کی شعری زبان میں نئے الفاظ کسی شعوری کوشش کے بغیر وزن کے ارکان میں اپنے لیے موزوں جگہ بنا لیتے ہیں۔

ایسے صرف چند اشعار دیکھئے:

گزارے ہم نے کئی سال ایسے دفتر میں
کنواری لڑکی رہے جیسے غیر کے گھر میں

آ جاتا ہے خود کھینچ کر دل سینہ سے پٹری پر
جب رات کی سرحد سے اِک ریل گزرتی ہے

بلڈنگیں لوگ نہیں ہیں جو کہیں بھاگ سکیں
روز انسانوں کا سیلاب بڑھا جاتا ہے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رُک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارا جیسا لگے

سنسان راستوں سے سواری نہ آئے گی
اب دُھول سے اَٹی ہوئی لاری نہ آئے گی

بہت سنبھال کے رکھا تھا نیک بیوی نے
ہَوا چلی تو بُرادہ بکھر گیا گھر میں

یہاں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے۔ اشعار کی معنویت اور الفاظ کے صوتی آہنگ میں یہ ذرا بھی اجنبی نہیں لگتے۔ اس میں شاعر کی خلاّقی اور اُپج کا بھی بڑا دخل ہے۔

OO

(بشیر بدؔر: فن و شخصیت، مرتبہ: رفعت سلطانہ و ڈاکٹر رضیہ حامد)

□ ڈاکٹر شارب ردولوی

بشیر بدؔر کا شعری سفر

بشیر بدؔر کا تیس سال سے زائد کا شعری سفر میری نگاہ کے سامنے ہے، جس میں وہ بہت سے نشیب وفراز سے گزرے ہیں۔ یہ نشیب وفراز ان کی زندگی اور اقتصادی حالت سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور ان کے ذہن وفکر سے بھی۔ وہ اپنے اس وقت کے حالات اور ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ زود حس انسان ہیں۔ حالات کا ردِّ عمل ان پر کچھ زیادہ ہی شدید ہوتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ارادے کی پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے جب پولیس کی ملازمت ترک کی اور دوبارہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو ہم لوگوں کا خیال تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ اس گاڑی کو چلانا مشکل ہوگا، لیکن انھوں نے ہم سب کے شبہات کو غلط ثابت کر دیا۔

علی گڑھ بشیر بدؔر کی ذہنی وفکری بالیدگی کے لیے بہت راس آیا۔ علی گڑھ کی فضا ہمیشہ ہی تخلیقی فنکاروں کے لیے فکر انگیز رہی ہے۔ مجاؔز، سردار جعفری، جاں نثار اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار سب کا کسی نہ کسی طرح تعلق علی گڑھ سے رہا ہے۔ علی گڑھ نے بشیر بدؔر کی فکر پر بھی جلا کی۔ یہ زمانہ جدیدیت کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ غزل اور نظم نئے تجربات سے دوچار تھی۔ علی گڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور پروفیسر آل احمد سرور جدیدیت کے میرِ کارواں تھے۔ اظہار ایک نیا اسلوب اختیار کر رہا تھا۔ نئی تراکیب، تشبیہات، استعارات اور علامتیں سامنے آ رہی تھیں۔ پرانی قواعد اور زبان کے اصولوں سے انحراف فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ بشیر بدؔر کے یہاں جبلی طور پر ایک نئی اُپج تھی۔ فراقؔ سے ذہنی قربت اور 'رُوپ' کی رباعیات کے تاثر نے انھیں اپنی زمین سے قریب تر کر دیا تھا۔ پیچیدہ تراکیب اور مفرس الفاظ سے ان کو کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے اس نئی ادبی فضا اور رجحانات کا

حصہ بننے میں انھیں کوئی دُشواری نہیں ہوئی۔

جدیدیت بیشتر لوگوں کے یہاں Ahopted رجحان تھا۔ زبان کے مروّجہ اصولوں سے انحراف اور مخصوص لفظیات کا استعمال مایوسی، ناکامی، شکست اور تنہائی کی فضا کی تکرار اس کی شناخت تھی۔ بشیر بدؔر بھی اسی کارواں میں شامل تھے لیکن قدرے مختلف تھے۔ ان کے یہاں خیال و اظہار میں جو تازگی اور نیا پن تھا اس نے انھیں وہاں بھی نمایاں رکھا اور شاید یہیں سے ان کی شاعری کا ایک نیا سفر شروع ہوا۔

تیس سال کے اس سفر میں بشیر بدؔر کی شاعری تین نمایاں موڑ سے گزری ہے۔ ایک ان کی شاعری کا وہ زمانہ ہے جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ جس زمانے کی ساری چیزیں مطبوعہ شکل میں نہیں آئیں، لیکن اس کے نشانات 'اکائی' میں کہیں کہیں ضرور دیکھے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ 'اکائی' کی اشاعت کے وقت تک ان پر جدیدیت کے اثرات غالب ہو چکے تھے۔ دوسرا موڑ 'امیج' میں نظر آتا ہے، جہاں وہ جدیدیت کے نمائندہ شاعروں میں شمار ہونے لگے تھے اور خود ساختہ علامتوں اور استعاروں میں بات کرنے کو ہنر سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری کا تیسرا موڑ 'آمد' ہے جہاں وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان تینوں مجموعوں سے ان کے ذہنی سفر اور نشیب و فراز کا آسانی سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

بشیر بدؔر کی شاعری میں مجموعی حیثیت سے جو خصوصیت بہت واضح طور پر نظر آتی ہے وہ ان کے یہاں زبان کا مخصوص استعمال ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ غزل کی ایک تہذیب اور مخصوص طرح کا ڈھانچہ ہے اور وہ بہت زیادہ آزادی کا متحمل نہیں ہو سکتا انھوں نے زبان، لفظیات اور خیال تینوں میں اچھی خاصی آزادی لی ہے۔ زبان کے سلسلے میں اُردو شاعری میں تین روایتیں نظر آتی ہیں۔ یوں تو روایتیں اور بھی ہو سکتی ہیں لیکن کسی نہ کسی جگہ ان کا سلسلہ انھیں تین روایتوں سے مل جاتا ہے، جس میں ایک روایت اُردو معلّٰی کی ہے۔ دوسری نظیؔر کی عوامی زبان کی ہے اور تیسری آرزوؔ کی سریلی بانسری کی۔ ان میں نظیؔر کو چھوڑ کر موضوع کے اعتبار سے دوسری دونوں روایتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بشیر بدؔر کا رشتہ نظیؔر کی روایت سے ملتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو 'جزویست پیغمبری' کی سطح سے اُتار کر عام زبان میں عام زندگی اور اس عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا حصہ بنا دیا ہے، جس سے اس طرح اُردو

غزل آشنا نہیں تھی مثلاً ان کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہی شہر وہی راستے وہی گھر ہے وہی لان بھی
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

ہنسی معصوم سی ، بچوں کی کاپی میں عبارت سی
ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اُتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا
لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

ہے سردی واقعی لیکن گھنے کہرے کی یورش میں
پہاڑوں سے اُترتی ان بسوں کو کون دیکھے گا
ابھی اپنے اشاروں پر ہمیں چلنا نہیں آیا
سڑک کی لال پیلی بتیوں کو کون دیکھے گا

بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی یہ دُنیا دُلہن ہے جلائی ہوئی

حویلی کا سورج جھکائے تھا سر اُداسی کی بیلیں تھیں دالان میں

چرواہا بھیڑوں کو لے کر گھر گھر آیا رات ہوئی
تو پنچھی دل تیرا پنجرا، پنجرے میں جا رات ہوئی

سر پہ سایہ سا دستِ دُعا ، یاد ہے
اپنے آنگن میں اِک پیڑ تھا ، یاد ہے

سناٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

بارشوں میں کسی پیڑ کو دیکھنا
شال اوڑھے ہوئے بھیگتا کون ہے

یہاں پر میں نے ان کی صرف چند غزلوں کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں غزلوں کی فضا عام غزلوں سے مختلف ہے۔ وہ ایسی تشبیہات اور استعارے استعمال کرتے ہیں جو ان کو اپنی تخلیق ہیں اور جو غزل کی روایتی فضا سے عام طور پر تعلق نہیں رکھتے۔ خود ان اشعار میں لان، دریچے، انار کا درخت، پرانی دلائیاں، حویلیاں، بچوں کی کاپی، ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے، گرم کپڑوں کا صندوق، یادوں کی کافور جیسی مہک، جنگلی آم کی جان لیوا مہک، سڑک کی لال پیلی بتیاں، چرواہا، بھیڑ، پنچھی، پنجرا، شال اوڑھے ہوئے، بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی وغیرہ کچھ گیت کی فضا سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ نظم کی فضا سے۔ بشیر بدؔر نے اس طرح کی بہت سی ترکیبیں اور تشبیہیں استعمال کی ہیں جن کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے انھوں نے اس طرح کے الفاظ سے اپنی غزل کو ایک نیا ڈکشن دینے کی کوشش ہے۔ اس کے علاوہ غزل کے روایتی موضوعات کو بھی انھوں نے تبدیل کیا ہے۔ اور خیال آرائی اور فلسفہ طرازی کے بجائے اسے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور محرومیوں سے بالکل عام اور سادہ زبان میں جوڑنے کی کوشش کی ہے انھوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے:

سنوار نوک و پلک ابروؤں میں خم کردے
گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کردے

اور انھیں گرے پڑے لفظوں پر انھوں نے اپنی غزل کی بنیاد رکھی ہے۔ اُردو غزل کے لیے یقیناً یہ نیا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ کتنوں دِنوں زندہ رہے گا اس کے بارے میں پیشین گوئی مشکل ہے، لیکن چونکہ مشاعرہ کا سامع خاص طور پر اور اُردو کا قاری عام طور پر اس ذخیرۂ الفاظ سے نامانوس ہوتا جارہا ہے اس لیے یہ تجربہ مخصوص حلقے میں مقبول بھی ہوسکتا ہے۔

بشیر بدؔر ایک حساس شاعر ہیں اس لیے اس تجربے سے الگ بھی بہت سے اچھے اشعار ان کے کلام میں مل جاتے ہیں جن میں آج کی زندگی اور اس کے پیچ در پیچ مسائل کی بہت اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً یہ چند اشعار دیکھیے:

کہاں سے آئی یہ خوشبو یہ گھر کی خوشبو ہے
اس اجنبی کے اندھیرے میں کون آیا ہے

سب گناہوں کا اقرار کرنے لگیں
اس قدر خوبصورت سزائیں نہ دے

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اِک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ہم کو بیکار لیے پھرتے ہو بازاروں میں
ہم نہ یوسف ہیں نہ یوسف کے خریداروں میں

آنسوؤں سے مری ہتھیلی پر
کون پڑھتا کہ اس نے لکھا کیا

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

یہ اشعار بشیر بدؔر کے محسوسات ہی کی کامیاب عکاسی نہیں کرتے بلکہ عصری مشیت کے بھی ترجمان ہیں۔ بشیر بدؔر کی کامیابی اور مقبولیت کا یہی راز بھی ہے کہ وہ عام جذبات کو عوامی زبان میں بڑی سادگی کے ساتھ ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں کسی طرح کا تصنع یا بناوٹ نہیں ہے۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر اپنے گاؤں اور قصبات کی سوندھی مٹی اور بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوتا ہے خدا کرے کہ یہ خوشبو یوں ہی بڑھتی اور پھیلتی رہے۔

○○

□ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

ڈاکٹر بشیر بدؔر کی تنقیدی کتاب

'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ'

ایک جائزہ

اُردو غزل کی سخت جانی کہیے یا اس کی مقبولیت کہ ہر دور میں اس کو دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں ایک امتیاز حاصل رہا ہے۔ جو لوگ زمانے کو خارجی عوامل سے جوڑتے ہیں ان کے نزدیک وہ ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم ہے، مگر ان زمانوں کے الگ الگ ہونے کے ساتھ ان میں ایک ایسا رشتہ بھی ہے جو قصہ جدید و قدیم کی بحث کو ایک وحدت میں پرو دیتا ہے۔ ماضی اپنے حال سے مل کر اور حال اپنے مستقبل سے اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر ان کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ یہ دھارے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں اور پھر کہیں کسی منزل پر آ کر مل جاتے ہیں۔ یہ لین دین صرف زبانوں کے اتفاق و اختلاف کا نہیں ہوتا بلکہ ان میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور معاشی اثرات بھی اپنا عکس دکھاتے ہیں۔

بیسویں صدی کی غزل کی نوعیت اپنے ماضی سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس عہد میں مختلف تحریکوں اور رجحانات نے اتنی تیزی سے کروٹیں لیں کہ غزل کے علاوہ شاید کوئی دوسری صنفِ سخن ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اس عہد میں غزل نامور بھی ہوئی اور رُسوا بھی۔ مختلف تجربات نے اس میں معنویت بھی پیدا کی اور اس کو بگاڑا بھی۔ خیر و شر کی اس کشمکش اور اتصال و افتراق سے غزل نے کس طرح اپنی انفرادیت قائم رکھی یہ تاریخ ادب کی دلچسپ کہانی ہے۔

1947ء کے بعد اُردو غزل نے ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ اس دور میں غزل نے تقسیم ہند

کا خوں ریز منظر بھی دیکھا۔ ترقی پسند تحریک کا عروج و زوال بھی سامنے آیا۔ جدیدیت کے نئے تجربات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ایک نئے ملک پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس نے اپنی شناخت کے لیے اصرار بھی کیا۔ اگر ان دو ملکوں (ہندوستان اور پاکستان) کے رجحانات کا تجزیہ کریں تو ایک طبقہ وہ ملے گا جو ان دونوں کو الگ الگ دبستانِ فکر کا نام دے گا۔ دوسرے طبقہ کا اصرار ہے کہ ہندوستان سے جانے والوں نے یا غیر منقسم ہندوستان کے پاکستانیوں نے جس شاعری کو فروغ دیا وہ صرف توسیع ہے کوئی الگ دبستان فکر نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں کے درمیان مفاہمت کا راستہ بھی نکالنے کی کوشش کی۔ مگر دونوں ملکوں کے سامنے ایک سوالیہ نشان ضرور رہا کہ آزادی کے بعد کیا اُردو غزل کی ضرورت ہے؟ کیا اس میں یہ وسعت ہے کہ موجودہ دور کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکے اور دوسرا سوال تھا کہ اس عہد میں اُردو غزل نے ترقی کی یا اس کا تنزل ہوا؟ ان تمام سوالات کی کہانی ہے بشیر بدؔر کا تحقیقی مقالہ یعنی 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ'۔ مجھے اس کتاب کا جائزہ لینا ہے، سرِدست بشیر بدؔر کی شاعری اور شخصیت سے بحث نہیں ہے۔ اگر گفتگو کے دوران ان میں سے کسی بات کا ذکر آ جائے تو اس کو ضمنی سمجھا جائے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ اپنے عہد پر تبصرہ کرنا سب سے مشکل ہے۔ بشیر بدؔر نے 1947ء سے 1971ء تک ہندوستان اور پاکستان کی اُردو غزل کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں ترقی پسند اور جدیدیت پسند شعرا کی نمائندگی ہے۔ آزادی کی داستان بھی ہے اور فسادات کے روح فرسا واقعات بھی۔ اصنافِ سخن میں غزل سب سے حساس صنفِ سخن ہے اس لیے ان واقعات کو غزل نے اس طرح پیش کیا کہ زبان سے نکلی ہوئی بات دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔ غزل نے ہر دور میں عصری آگہی کا ثبوت دیا ہے اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اس عہد کے مسائل اور مصائب سے چشم پوشی کرتی۔ بشیر بدؔر نے جس خوبی سے ان تمام حالات کا احاطہ کیا ہے اس کے لیے وہ قابلِ مبارکباد ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عام طور سے ان کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے مگر بقول شخصے: "جب میں ملٹن پڑھتا ہوں تو میرے تحت الشعور میں یہ ہوتا ہے کہ میرا رشتہ ملٹن سے کیا ہے۔" بشیر بدؔر بھی نظریات کی بحث میں اس سے دامن نہیں بچا سکے۔ مثلاً ترقی پسندی پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں ان کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا

ہے اور ان میں بڑی حد تک صداقت بھی ہے۔ مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پورے عہد کو متاثر کرنے والی تحریک میں کوئی خوبی ضرور ہوگی جس نے مدتوں اپنا سحر قائم رکھا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے موازنہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسندی کی تمام خامیوں کے باوجود یہ امر مصدقہ ہے کہ اس کے پیچھے ہمارے دانشوروں کا عمل بھی شامل تھا۔ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے پاس صحت مند روایتیں بھی تھیں۔ ان کے بہت سے بڑے شاعروں نے اپنی ترقی پسندی کے باوجود کلاسکیت سے رشتہ نہیں توڑا تھا۔ لیکن جس طرح ہر شخص کی عمر ہوتی ہے اسی طرح تحریکوں کی بھی عمر ہوا کرتی ہے اور جب وہ اپنا رول ختم کر دیتی ہیں تو ان کی ضرورت نہیں رہتی، یہی سب کچھ ترقی پسندی کے ساتھ بھی ہوا۔ اب ترقی پسندی کے احیا کی کوشش محض باسی کھچڑی میں اُبال کی طرح ہے۔ پھر ذرا ہندوستان اور پاکستان کی ترقی پسندی کے رجحانات کا جائزہ لیجیے تو یہ حقیقت زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آجائے گی۔ اس کا سبب بنیادی نظریہ نہیں تھا بلکہ بقول جذبی صاحب 'جماعت کی پالیسی' تھی یا 'مصلحت پسندی' اور یہ دونوں باتیں غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

بشیر بدؔر نے ایک جگہ محاورہ کی بحث میں کہا ہے: ''ایک دور کا محاورہ دوسرے دور کے لیے اجنبی اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ محض محاورہ کے حسن اور برجستگی پر کوئی شعر اچھا نہیں ہوسکتا۔'' یہ درست ہے کہ محاورہ اپنے عصری حالات اور مطالبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان پر سماج کے اثرات کے علاوہ موسم اور جغرافیائی عناصر کا بھی اثر ہوتا ہے لیکن اچھے محاورہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ماحول میں اپنی جگہ بنالیتا ہے اس کا نہ اثر ختم ہوتا ہے اور نہ حسن۔ ذیل کے اشعار انیسویں صدی کے اور بیسویں صدی کے اوائل کے ہیں۔ کیا ان کے حسن اور اثر میں کوئی کمی نظر آتی ہے؟

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
(دردؔ)

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک
(فانیؔ)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
(انشا)

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر   ہے پیارے ہنوز دلی دُور
(میر)

شکوہ کرنے کی خُو نہ تھی اپنی   پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
(حالی)

غزل اور نظم کی بحث بہت پرانی ہے۔ حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' اور ترقی پسند تحریک نے غزل پر جو ضرب لگائی اس نے کچھ عرصہ کے لیے ایوان غزل میں ہلچل پیدا کر دی، مگر یہ کیفیت عارضی تھی اور غزل کا پرچم بدستور لہراتا ہے۔ بشیر بدرؔ نے سرور صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے:

> ''پروفیسر آل احمد سرور نے غزل کی مقبولیت کی وجہ یہ بتائی کہ یہ اس عہد میں یعنی خیالات کے جذباتی ترسیل کا سب سے مقبول ذریعہ ہے لیکن اس کے باوجود نظم کی اہمیت زیادہ جگہ ہے۔''

اس بیان میں خود اپنی بات کا تضاد محسوس ہوتا ہے۔ غزل کو 'ترسیل کا سب سے مقبول ذریعہ' بھی کہتے ہیں اور 'نظم کی اہمیت زیادہ' بھی بتاتے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر اصنافِ سخن پر نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ اقبالؔ اور جوشؔ کی نظموں میں سب سے اعلیٰ نظمیں وہی ہیں جن میں غزل کا آہنگ ہے۔ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ فلاں غزل میں نظم کا لطف ہے۔ مثال یہی دی گئی کہ فلاں نظم یا قصیدہ کا حسن اس لیے ہے کہ اس میں غزل کا لب ولہجہ شامل ہے۔ غزل کے سلسلہ میں بشیر بدرؔ کا انداز متوازن ہے۔ غزل ہی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بحث تقلید میر کی بھی ہے۔ دور حاضر میں سائنسی تجربات جدیدیت اور ترقی پسند شاعری کا واسطہ دے کر نئے تجربات کی کتنی ہی بات کی جائے مگر آج بھی اعلیٰ غزل کے لیے علامت میرؔ اور اور غالبؔ ہی قرار دیے جاتے ہیں۔ اکثر شعرا اپنی شناخت کے لیے میر سے وابستگی کو فخر خیال کرتے ہیں۔ اس موقع پر سیّد عبداللہ کا وہ لطیفہ شاید بے محل نہ ہو۔ ایک محفل میں کسی نے اپنی میرؔ سے بیزاری کا اظہار اس طرح کیا کہ: ''اگر میرے بس میں ہوتا تو میرؔ کو شوٹ کر دیتا۔''

سیّد عبداللہ کسی دوسری طرف متوجہ تھے۔ چونک کر قریب کے ساتھی سے دریافت کیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان صاحب نے ان کے الفاظ دہرا دیے۔ سیّد عبداللہ کہنے لگے کہ: ’’مگر ان سے یہ تو دریافت کرو کہ میرؔ کو شوٹ کرنے کے لیے اتنی بڑی بندوق کہاں سے لائیں گے۔‘‘ بہر نوع بات طرزِ میرؔ اور تقلیدِ میرؔ کی ہو رہی تھی۔ غالبؔ زندگی بھر ’طرزِ بیدلؔ‘ کو ’مزاجِ بیدلؔ‘ خیال کرتے رہے اور کبھی بیدلؔ کی روح کو نہ پا سکے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو میرؔ کے لہجہ میں شعر کہہ کر میرؔ کی روح میں سما جانے کا اعلان کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں جو میرؔ کو محض غم کا شاعر سمجھتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ وہ صفات لگا دیتے ہیں جو غم سے متعلق ہیں۔ لیکن بشیر بدؔر کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے:

> ’’اس امر کا اعتراف ضروری تھا کہ میرؔ سے نئی نسل کے اچھے شاعروں نے اپنی انفرادیت کی تشکیل کرنا سیکھا ہے اور ان کی لفظیات کی تقلید ان شاعروں نے کی ہے جن کی بذاتِ خود ادب میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔‘‘ (ص 158)

کچھ عرصہ پہلے ادبی فضا پر جدیدیت کی گونج رہی۔ کچھ لوگوں نے اس کو تحریک سے منسوب کیا اور بعض لوگوں نے اس کو صرف رجحان کہا ہے۔ ایک طبقہ وہ بھی تھا جو اس کو ترقی پسندی کے خلاف ایک محاذ خیال کرتا تھا اور دوسرا گروہ ترقی پسندی کی توسیع کہتا تھا۔ غرض تاویلوں میں معنی گم ہو کر رہ گئے۔ دراصل جدیدیت ایک بحرانی دور کی پیشکش ہے۔ طبقاتی کشمکش، جنگ، ذہنی تناؤ، بے بسی، بے کیفی، بے اعتمادی غرض ان تمام باتوں نے انسانی ایقان کو متزلزل کر دیا اور ایک تھکے ہوئے انسان کی طرح کسی سایہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے ’راس آنے‘ کی بات کہی ہے۔ بہر نوع یہ ایک طویل بحث ہے اس کو کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کرتے ہیں۔

دورِ جدید کا المیہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے فوٹو گرافی اور مصوری کے فرق کو کم سمجھا ہے۔ انھوں نے عام طور سے ہر بیانیہ انداز کو مصوری سے تعبیر کیا ہے۔ شاعری یقیناً حقیقت کے اظہار کا دوسرا نام ہے مگر ہر حقیقت کا اظہار نہ شاعری کے لیے ضروری ہے اور نہ اس کی کوئی افادی قدر و قیمت ہے۔ مصوری دراصل انتخاب کا دوسرا نام ہے اور اس کے رشتے جا کر جمالیاتی احساس سے مل جاتے ہیں۔ شاعری میں رنگینی اور رعنائی اس وقت آتی ہے جب خود شاعر کی نظر میں

رنگینی و رعنائی ہو۔ اسی لیے جہاں تخیل کی بلندی پر زور دیا گیا ہے وہاں اس کو بے لگام ہونے سے روکا گیا ہے۔ بشیر بدؔر نے اپنے اتنے اہم مقالہ میں اس پہلو کو نظر انداز کردیا یہاں پر چند معروضات کی طرف اشارہ کروں گا جن کو بشیر بدؔر صاحب نے اپنے مقالے میں تحریر کیا ہے۔

(۱) ''اس دور میں شاید پہلی بار چند شاعروں کے وسیلے سے یہ لے عام ہوئی ہے کہ 'تغزل' چند مقررہ رموز و علائم، تشبیہ و استعارے اور لفظیات کا نام نہیں ہے۔'' (ص168)

حالانکہ ہر دور میں تغزل کا لب و لہجہ اور معنویت بدلتی رہی ہے۔ یہ سلسلہ ہر بڑے شاعر کے یہاں اپنی افاقیت کے ساتھ موجود ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ وغیرہ۔

(۲) ''جدید غزل میں نئے انسان کی دریافت ہے۔ یہ انسان نظریوں اور سیاسی عقائد کا انسان نہیں ہے بلکہ پوری زندگی کا انسان ہے۔'' (ص371)

روایتی شاعری سے قطع نظر انسان کی تلاش ہر دَور میں ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے کی ہے:

کز دام ودو مسلولم وانسانم آرزوست

خدا ساز تھا آذر بُت تراش ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

(میرؔ)

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(غالبؔ)

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اُٹھے
پڑھا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

(فانیؔ)

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

(دردؔ)

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ دَرویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

(اقبالؔ)

ایسے اشعار کی کمی نہیں جہاں انسان کی تلاش بھی ہے اور نئے انسان کی دریافت بھی مگر فطرتِ انسانی ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔

اس مقالہ میں ایک بات برابر کھٹکتی رہی اور وہ یہ کہ بشیر بدؔر نے جابجا اپنے دعوے کی دلیل میں لگا۔ یہ سب اگر چہ زندگی کی حقیقتیں تھیں مگر صحت مند حقیقتیں نہیں تھیں۔ ان حالات میں پیدا ہونے والی بے اطمینانی اور بے یقینی نے انسان کو اس کے ماحول سے بے گانہ کر دیا۔ بات کو کہنے کے لیے علامتوں کی ضرورت ہوئی اور ان علامتوں کے تجربوں نے شعر کو اُلجھا کر رکھ دیا۔ ذیل کے اشعار میں بشیر بدؔر کو معنویت نظر آئی اور میں معنی کی تلاش میں ہوں:

اب ٹوٹنے ہی والا ہے تنہائی کا حصار اِک شخص چیختا ہے سمندر کے آر پار

(عادل منصوری)

مل گئے سارے عقائد خاک میں پانیوں میں بہہ گیا سورج مرا

(کمار پاشی)

سورج تو پتھر کی آڑ سے نکلا تم اب کس کا راستہ روکے بیٹھے ہو

(خلیل رامپوری)

سورج کے ساتھ سرابوں کے دشت میں دو گز چلی تھی اور زمیں ہانپنے لگی

(لطف الرحمٰن)

غزل ہو یا نظم اس کا پہلا مقصد ابلاغ ہے، مگر یہاں ابلاغ نصیبِ دشمنان ہے۔ اس کے جواز میں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ کلاسیکی شاعری میں بھی تو آخر رمزیت ہے۔ اس پر کبھی معترض نہیں ہوئے، لیکن ذیل کے اشعار پڑھیے اور بتایئے کہ اس رمزیت میں اور اشعار بالا کی رمزیت میں کوئی مناسبت ہے؟

کہاں کے لال و گل کیا بہار توبہ شکن
کھلے ہوئے ہیں دِلوں کی جراحتوں کے چمن

(جگرؔ)

نہ میکدہ پر زوال آتا، نہ مے پرستوں میں پھوٹ پڑتی
صراحی تقسیمِ مے سے پہلے ہی دستِ ساقی سے چھوٹ پڑتی

(میکش بدایونی)

نہیں یارانِ چمن عیش کا ہنگامہ ابھی
کچھ گرفتار تڑپتے ہیں تہہ دام ابھی

(جوہر بدایونی)

اسی طرح سورج سایہ، ہوا، اندر باہر، خورشید کی بیٹی، سمندر کی پیاس، لفظوں کے ہاتھوں دریچے کا رونا وغیرہ یہ سب ژولیدگی کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی کی توجیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہمارے ملک کو (خواہ ہندوستان ہو یا پاکستان) کسی انقلابی پروگرام سے سابقہ نہیں پڑا۔ اگر آزادی کے لیے ہماری جنگ انگریزوں سے ہوتی اور اس میں ہزاروں آدمی شہید ہو جاتے تو ہمارا سر بلند ہو جاتا، مگر ہزاروں کا خون فساد کی نذر رہا اور انتشار کی لے تیز رہی۔ اس لیے شاعر کے ذہن میں اس انتشار کا ہونا ناگزیر تھا اور اس نے اپنی ذات میں واپس چلے جانے میں عافیت سمجھی اور شاید یہی سبب ہے کہ گیان چند جین نے جب یہ کہا کہ رابنس کروسو کے جزیرہ میں تنہائی کی زندگی میں 1960ء کی غزلوں کو ترجیح دوں گا اور وہ غزلیں ان کو راس آئیں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات انھوں نے جدیدیت کی تائید میں کہی یا صرف امر واقعہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس تنہا جزیرہ میں جہاں جدوجہد اور عمل کے راستے بند ہوں وہاں صرف ذات کا سفر ہی ساتھ دے سکتا ہے۔ یہاں غالباً انھوں نے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اپنے اشعار پیش کیے ہیں۔ ہمارے مشرقی آداب میں ویسے بھی واحد متکلم کے صیغہ کو استعمال کرنے میں احتیاط کی ہدایت ہے۔ یہی سبب ہے کہ رشید احمد صدیقی کے معترضین نے ان کے لفظ 'میں' پر اعتراض کیا ہے۔ بہر نوع رشید احمد صدیقی کے یہاں واحد متکلم کا صیغہ ان کے تخلیقی ادب کا ایک حصہ ہے۔ 'مستند ہے میرا فرمایا ہوا' کی منزل کب آتی ہے اس سے اہلِ ادب بخوبی واقف ہیں۔

مجموعی طور پر بشیر بدؔر کی تصنیف قابلِ داد ہے۔ جس وضاحت اور خوبصورتی سے انھوں نے 1947ء کے بعد کی غزل کا جائزہ لیا ہے اس نے اس عہد پر کام کرنے والوں کے

لیے راستے کھول دیے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا جس بصیرت اور بصارت کے ساتھ جائزہ لیا ہے وہ ان کے محسنات میں سے ہے۔ دورِ جدید کے مطالبات کو عہد حاضر کے شعرا نے کس طرح غزل کے واسطے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس کا خوب صورت اظہار بشیر بدؔر کے یہاں موجود ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی اس کے بین السطور میں ہے، یعنی جن مسائل کو بشیر بدؔر نے جائزہ کے انداز میں پیش کیا ہے وہ دراصل ہمارے ناقدین کے لیے سوالیہ نشان بھی ہیں۔ ان سوالات کو حل کرنے کے لیے بشیر بدؔر کی تصنیف (آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ) کے راستے سے گزرنا پڑے گا۔ یہ مختصر جائزہ ہے، کتاب کے ہر پہلو پر گفتگو ممکن نہ تھی۔ کچھ بکھرے خیالات کو یکجا کردیا ہے اس لیے اُمید ہے کہ قارئین تفصیل کا مطالبہ نہیں کریں گے۔

OO

□ پروفیسر شمیم حنفی

شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں

بشیر بدؔر ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن کا سخن الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ سو میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ غالبؔ یا میرؔ میں کس کی قبیل یا کون سے اسلوب کی وساطت سے پہچانے جائیں گے مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان کی غزل کا خمیر اپنی حدود کے ساتھ مجھے اسی مٹی سے اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جس کی مہک میرؔ کے کلام میں پھیلی ہوئی ہے شاید اسی لیے ان کی شاعری مجھے شروع سے پسند رہی ہے، اور علی گڑھ کے زمانہ قیام میں جب کبھی وہ اپنی ادھوری غزلیں یا اِکا دُکا شعر بھی سناتے تھے تو میں اس احساس کے ساتھ ان کا لطف اٹھاتا تھا کہ وہ خود پر بیتے ہوئے کسی واقعہ کا بے تکلف بیان کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں ہمارے زمانے میں بے تکلف شعر کہنے کی عادت ختم ہوتی جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بے تکلفی شعری تجربے میں عمومیت یا سہل پسندی کا جو فریب پیدا کرتی ہے۔ اس سے ہمارا شاعر ڈرتا ہے؟ دوراز کار استعارے بہت سڈول اور ترشے ہوئے پیرایۂ اظہار کا حامل کچھ اور ہو نہ ہو یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان وسیلوں سے آراستہ ہونے کے بعد شعر بادی النظر میں خاصہ متین اور باعزّت دکھائی دیتا ہے۔ یوں بھی ہمارے یہاں گہرے تجربوں اور نادر خیالوں کے پیچھے بھاگنے کی وبا بہت عام رہی ہے اور مجرّدات نے مظاہر کا بہت تیا پانچا کیا ہے۔ لیکن تجربہ میں گہرائی تو اس میں ڈوبنے سے آتی ہے اور خیال کا معاملہ یہ ہے کہ نادر نہ ہو جب بھی اپنی سچی تخلیقی سطح پا لے تو دل فریب ہو جاتا ہے:

ہاں اے غمِ دنیا درِ مے خانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

جیسے شعر نکتہ رس نقّادوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے ہوں، مگر اس نوع کے شعروں سے عدم کا اپنا

امتیاز بھی اُبھرا۔ اور بے تکلف شعر کہنے کے گم ہوتے ہوتے چلن کی تھوڑی بہت تجدید بھی ہوئی۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ ایسا شعر کبھی کبھی آپ اپنا حجاب بن جاتا ہے۔ بہت زمانہ گزرا بشیر بدؔر نے ایک شعر کہا تھا:

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

شہرت کے معاملے میں بشیر بدؔر کے اس شعر کا موازنہ کیا جائے تو شعرا اپنے شاعر سے دو چار گز آگے ہی دِکھائی دے گا۔ اس کا سبب کیا ہے؟ شعر کے عام شائق کی سہل پسندی برحق مگر آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ بے تکلف شعر کا ردِّ عمل بھی ذہن، جذبے یا احساس کی سطح پر بے تکلف ہوتا ہے اور جس طرح ایک عام آدمی کبھی کبھار چلتے چلاتے کوئی ایسا فقرہ ایجاد کر جاتا ہے جو بہت سی نکتہ طرازیوں کا وزن کم کر دے۔ اسی طرح بے تکلف اشعار بھی بظاہر رواداری میں اکثر وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جسے فکر کے ایک جاں گداز سفر کا حاصل پکارا جا سکے۔ اس نوع کی مثالیں بشیر بدؔر کی غزلوں میں ایک دو نہیں درجنوں کے حساب سے دیکھی جا سکتی ہیں اس وقت میرے سامنے ان کی چند غزلیں ہیں مگر یہ شرارے ان میں صاف روشن نظر آتے ہیں:

دِلوں کی جہاں پائمالی رہی   وہ بستی چراغوں سے خالی رہی
کبھی جب تمھارا خیال آ گیا   کئی روز تک بے خیالی رہی

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے   یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

خدا ایسے احساس کا نام ہے   رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں   کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی   یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو؟ رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

شام کے بغیر بچّوں سے کیسے ملوں؟ اب مرے پاس کوئی کہانی نہیں

خواب جس دل میں رہا کرتے تھے کب کا مر چکا
کس کا دروازہ یہ بچّے کھٹکھٹانے آئے ہیں

ایک غزل کے تین شعر بھی دیکھئے:

تحریر و گفتگو میں کسے ڈھونڈتے ہیں لوگ تصویر میں بھی شکل ہماری نہ آئے گی
سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی
پہچان ہم نے اپنی مٹائی ہے اس طرح بچّوں میں کوئی بات ہماری نہ آئے گی

شعر و ادب کے موجودہ منظر نامے پر نگاہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ اس ڈھب کے تجربوں پر کیا کیا مضامین باندھے گئے ہیں۔ ان تجربوں کی تعبیریں بھی اس طور پر کی گئی ہیں کہ بیسویں صدی کی دُنیا کا ہر آشوب خیال اور فکر کا ہر دھارا، روحانی، جسمانی، جذباتی مسئلوں کی ہر جہت ایک مرکز پر سمٹ آئی ہے۔ بڑے تجربوں کی یہ ارزانی دیکھ کر ایسے شعروں کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے بھی کہ شاعر نے ایک خطرہ مول لینے کی قوت کا ثبوت دیا ہے۔ اس اندیشے میں مبتلا ہوئے بغیر کہ اس کے شعر کی سادگی اور بے ساختگی فکری یا جذباتی سہل پسندی کی تہمت بھی اس کے سر لا سکتی ہے۔ اس نے دقت پسندی اور سہل پسندی کی حدیں ہی آپس میں گڈمڈ کر دی ہیں۔ ان شعروں میں حزن اور افسردگی کا دَبا دَبا سا احساس ان میں وہ ابدیت پیدا کرتا ہے جو درد بھرے تجربوں کی ہم رکاب ہوتی ہے۔

کئی بار یہ خیال ذہن میں آیا ہے کہ اپنے تئیں ضرورت سے زیادہ چوکنا رہنے والا شاعر گرانڈیل تجربوں یا افکار کی خارجی پرت میں اکثر اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی ذات کی آسودگی ہے یا پیش بندی کی ایک سطح جس پر وہ خود کو محفوظ تصوّر کرتا ہے جہاں وہ اس وسوسے کا شکار نہیں ہوتا کہ اس کا فرمایا ہوا روار وی میں ٹال دیا جائے گا۔ مگر شاعری تو دراصل

نام ہی اس عمل کا ہے جو تفصیلات کو حذف کرتا ہوا تجربے کے حشو و زوائد کو کاٹتا چھانٹتا ہوا افکار یا تجربوں کے مغز سے ایک سیدھا سچا ربط قائم کرتا ہے اور اپنے بنیادی سروکار کو جزوی اور ضمنی ترغیبات کی گرفت میں آنے نہیں دیتا۔ بشیر بدؔر نے بالعموم اسی رویےّ کی رفاقت کا ثبوت دیا ہے اور اس کی آزمائشوں سے سرخرو نکلے ہیں۔ یوں بھی ایک ٹھیٹ غزل گو ہونے کی حیثیت سے ان کا مزاج کسی ایک فکر کو بہت دیر تک سہارنے کا عادی نہیں ہے۔ اور ان کے تجربوں کی اساس ان کی جذباتی لہریں ہیں اور ان کا احساس یہ لہریں ہر آن متحرک رہتی ہیں، گردش کرتی رہتی ہیں اور ان کا رنگ تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے چنانچہ کسی معین تہذیبی یا سماجی یا فکری تناظر سے زیادہ وہ بہت مختلف النوع اور رنگارنگ تجربوں کے شاعر ہیں۔ ان کی قدر و قیمت ان کی شاعری کے مجموعی ماحول سے زیادہ ان کے الگ الگ شعروں کی کثرت آثار دنیادار کے واسطے سے متعین ہوتی ہے۔ اس رویےّ سے بشیر بدؔر کو فائدہ یہ پہنچا کہ وہ شعریت کی تکمیل کے عنصر کی شناخت اور شمولیت دونوں کے ہنر سے واقف ہو گئے۔ جہاں یہ عنصر پوری طرح ان کی گرفت میں آ گیا ہے۔ ان کا شعر ایک خود مختار اور مکمل واردات کی تصویر بن گیا ہے۔ ناکامی کی صورت میں کبھی کبھی سب مفردات اور الفاظ کا ایک مجموعہ بشیر بدؔر کا تخیل اپنی تصویر کے وسیلے گرد و پیش کی اس دنیا سے اخذ کرتا ہے جو واحد المرکز ہونے کے باوجود بہت بے ترتیب اور کثیر الجہات ہے۔ چنانچہ تجربے کی مرکزی وحدت کبھی اس کے مظاہر کے باہمی رشتوں کی پہچان میں کامیاب ہوتی ہے اور کبھی ان کے امتیازات پر اچھی طرح حاوی نہیں ہونے پاتی۔ ایسا نہ ہوتا تو مجھے واقعی حیرانی ہوتی، کیونکہ کامیابی کے ساتھ ساتھ ناکامی کے اس ملے جلے مرقع سے بشیر بدؔر کے تخلیقی تفاعل کا ایک بہت نمایاں امتیاز سامنے آتا ہے۔ ہمارے زمانے کے کم شاعروں نے اشیا اور مظاہر کی ایسی وسیع اور رنگ رنگ کائنات کو اپنے جذبے اور احساس کی تجسیم کا وسیلہ بنایا ہے جس کی مثال بشیر بدؔر کے کلام میں ملتی ہے انھوں نے ایک سی توجہ کے ساتھ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ موجودات، منظر اور تماشوں کی حصار بندی کا عمل اختیار کیا ہے۔ نظم گویوں کے یہاں یہ کام بظاہر جتنا سہل ہے غزل کے شاعر کے لیے اتنا ہی حوصلہ طلب اور دُشوار۔ یہاں اس کے اسباب کی نشاندہی کرنا غیر ضروری ہوگا کہ غزل کی روایت کے جبر اور اس کے خود ساختہ حدود کی پابندیوں سے سبھی واقف ہیں۔ ان

مجبوریوں کے پس منظر میں بشیر بدؔر کی غزل پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ان کے تخیل کی جسارت اور طبیعت کی مہم پسندی کا اثر صاف اُبھرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ بشیر بدؔر نے اپنے تجربوں کی ترتیب کے وسائل یا اس کے مرکبات کی تیاری میں غیر معمولی آزادی سے کام لیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے شوخ اور متین سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کی حد بندیوں کو بھی قبول نہیں کیا۔ چنانچہ وہ گنتی کے ان چند غزل گویوں میں ہیں جن کے یہاں غزل صرف غزل نہیں رہتی اور اپنے بیان کے لیے نت نئی وسعتوں کا مطالبہ کرتی ہے۔

شاید اسی لیے بشیر بدؔر کے صدہا اشعار میں خود کلامی سے زیادہ کہانی سنانے کا انداز دکھائی دیتا ہے۔ قصہ گوئی خالی خولی مجرّدات کے سہارے نہ اپنے ساتھ انصاف کر سکتی ہے نہ دوسروں کو مطمئن کر سکتی ہے اپنے بنیادی موقف یا مرکزی خیال کی ڈور چٹکیوں میں دبائے ہوئے قصہ گو قسم قسم کی آبادیوں اور ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ اور خدا جانے کیسے کیسے عجیب و غریب تماشوں میں اپنے فنّی مقاصد کا سراغ پاتا ہے۔ اس تماشے میں راہ کے روڑے یا خس و خاشاک اور سجے دھجے آراستہ منظر اور محلات سب کا سب یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ قصہ گو سے ان کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ جذبے اور نظر کی ایک سی مساوات کے ساتھ وہ انھیں برتنے کا سلیقہ اپنے آپ میں پیدا کرے کہ اس پورے تماشے کی توصیت اس کے سفر میں یکساں اور ناگزیر ہوتی ہے۔ اسے بالآخر جس درِ مقصود کی جستجو ہوتی ہے وہ اسی ہفت رنگ راستے سے ہو کر ہاتھ آتا ہے۔

بشیر بدؔر اس سفر سے کامیاب گزرے ہیں، مگر اس مسافر کا قصہ اس کی کامیابی پر ہی ختم نہیں ہوتا۔ ہمیں اس کے سفر کی اصل حقیقت کا بھید ان مراحل اور منازل کے پر پیچ رنگوں میں ملتا ہے، جن سے وہ دورانِ سفر قدم قدم پر دوچار ہوا۔ بشیر بدؔر کی غزل انھیں مرحلوں، منزلوں اور رنگوں کا آئینہ خانہ ہے:

پھول شاخوں کے ہوں کہ آنکھوں کے

راستے راستے چُنا کرنا

OO

□ مصوّر سبزواری

بشیر بدؔر: اجتہاد سے اعتبار تک

بشیر بدؔر کل ایک شعری اجتہاد کا نام تھا۔ آج بشیر بدؔر برصغیر کی ایک معتبر اور مؤثر تہذیبی علامت کا نام ہے۔ اجتہاد سے اعتبار تک کے اس تخلیقی سفر کی دریافت کے لیے میں نے بشیر بدؔر کو مشاعروں میں کبھی نہیں ڈھونڈا۔ میں نے ہمیشہ بشیر بدؔر کو بشیر بدؔر کے اندر ہی تلاش کیا ہے کیونکہ مشاعروں نے بشیر بدؔر کو جنم نہیں دیا بلکہ خود بشیر بدؔر نے جدید طرز کے مشاعروں کو جنم دیا ہے لیکن مشاعرہ سازی بشیر بدؔر کا تخلیقی کارنامہ ہرگز نہیں ہے یہ کام دوسرے لوگ بھی کرسکتے تھے۔ بشیر بدؔر نے جدید غزل کی مجرم شہزادی کو قدامت کے مہابلی کے ہاتھوں سے اس وقت کھینچا جب وہ دیواروں میں چنی جارہی تھی۔ یہ وقت کا وہ المناک موڑ تھا جب روایتی غزل بوڑھی ہو کر اپنا جمالیاتی اور لسانی حسن کھو چکی تھی اور غزل کے بدلتے ہوئے تیور اور نئے تخلیقی سانچے اربابِ ادب و دانش کی نظر میں اس قدر مدّھم تھے کہ اصلی اور غیر اصلی غزل جدید اور قدیم غزل کے کنفیوژن میں کوئی واضح لائحۂ عمل سامنے نہیں تھا۔ نئی نسل ہجرت کے آشوب میں گرفتار تھی۔ وجود کی پہچان عدم شناخت تھی پیدا ہونے کی تمنا یا پیدائش کے بے معنویت جاری تھی اظہار اور ترسیل کے بنجر وسیلے تھے۔ الفاظ ختم ہو کر اپنی موروثی لغات میں دفن ہو گئے تھے پورا معاشرہ الگ الگ جزیروں میں بٹا ہوا تھا اور سمندر کی غیر منقسم لہروں کی یگانگت اور ارتکاز سے سماج محروم تھا۔ ایک دورِ بے شناخت میں فکر وفن کے سارے معیار اور اظہار کے پھیکے اور بے اثر چہرے روبرو تھے۔ اپنی شناخت کے لیے روحانی ہجرت کا کرب بھی اوڑھا گیا اندرون اور بیرون کے سکوت اور سقوط کو نغمگی میں چھپایا گیا مگر عریاں بے مائیگی ایک بھیانک چیلنج تھی چند دوسرے جیالوں کے ساتھ بشیر بدؔر نے بھی اس سامنے کے چیلنج کو قبول کیا اور اس بدعہد اور منافق عہد میں بشیر بدؔر نے وہ استعاراتی اور تمثیلی شاعری پیش کی

جو نئی نسل کے بحران کی کشید ہے۔ بشیر بدؔر کی سب سے بڑی کوشش اور سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ انھوں نے عصری آشوب کو سیاست داں کے بجائے ایک دانشورانہ مگر مخلص شعور سے پہچانا ہے۔ اور اپنی ذات کے حوالے سے اپنی سماجی اجتماعی لسانی اور ثقافتی رشتوں کی بازیابی کے عمل کو تیز تر کیا ہے۔

بشیر بدؔر کی غزلیں حرب الکلمات یا لفظوں کا بے مغز رزمیہ نہیں ہے۔ ماڈّی اور حقیقی نتائج کے ردِّعمل سے رائیگاں ہوتی ہوئی سعی سے انھوں نے دانستہ گریز کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک مثبت اور جرأت مندانہ درد کا احساس بڑی شدّت سے قنوطیت اور خود سپردگی کی مانوس فضا کو خوش آئند بنانے کے لیے پہلے ہی ختم کر دیتا ہے۔ یہ حرکی رویہ شکست و ریخت کے سنگین مسائل سے نبرد آزما بھی ہوتا ہے اور ان سے عہدہ برآ بھی۔ لسانی تشکیل کی بے حد سادہ پرکاری بشیر بدؔر کی ایک محبوب صفت ہے۔ وہ الفاظ کو ایک کاہن کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک مشاق ساحر کی انگلیوں سے چھو کر ان میں جان ڈالتے ہیں، الفاظ کو تڑپاتے ہیں، گدگداتے ہیں، رُلاتے ہیں، ہنساتے ہیں اور الفاظ کی حدود اور ماہیت کا تعین کر کے انھیں ان سمتوں کی طرف روانہ کرتے ہیں جو ایک قطعی تازہ جہانِ معنی سے عبارت ہیں۔ پرانی غزل کی طرح نئی غزل کے سامنے بھی وحدتِ تاثر کا جو بھیانک مسئلہ ہے بشیر بدؔر اس سے جس طرح مبارزت کرتے ہیں وہ ساری شورش اور سرگرمی ان کے اشعار کا ہی نتیجہ ہوتی ہیں زبردست ترسیلی قوت خودکفالتی اور خودکفالتی اور خود آسودگی کے یہ نمونے اُردو غزل میں اب بھی کمیابی کی حد تک ہی ہیں:

کبھی حادثوں کے نشان بھی یہ ہوا مٹا کے چلی گئی
مرا دل وہ ریت کا دشت ہے جو کسی پھوار سے تر نہ ہو

کوئی لباس نہیں دل کی بے لباسی کا
اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

پھول شاخوں کے ہوں کہ آنکھوں کے راستے راستے چُنا کرنا

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ اب میرے لیے
کبھی چاندی کبھی سونے کے قلم آتے ہیں

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

ننگے پاؤں فرشتوں کا اِک طائفہ آسماں سے زمیں پر اُترنے لگا
سر برہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

الفاظ کی تخلیقی لذّت، امیج اور حسّیاتی پیکروں کے خوبصورت جال اور انوکھے اشاروں کے ذریعے مناظر کی وہ کشیدہ کہ عکاسی اصل سے زیادہ حقیقی اور بامعنی دکھائی دینے لگے بشیر بدؔر کی غزلوں کا امتیازی وصف ہے۔ یوں تو وہ ہر وادی کے سیاح ہیں لیکن انسانی جرم وسزا کے بنیادی موضوع پر انھوں نے جس قدر موثر نفسیاتی ردِعمل کی عبرت انگیزی سے جدید غزل کو آشنا کرایا ہے اور وہ بھی صرف دو مصرعوں میں اس کی نظیر جدید غزل میں شاید ہی نظر آئے:

تمام عمر مرا دم اسی دھویں میں گھٹا
وہ اِک چراغ جو میں نے کبھی بجھایا تھا

بشیر بدؔر کے جو بہتیرے اشعار زباں زدِ عام ہیں، میں ان سے گریز کر رہا ہوں۔ میں صرف وہ اشعار (وہ بھی قلیل تعداد میں) انتخاب کر رہا ہوں جن کی رفاقت میں بشیر بدؔر کو میں اپنے بہت قریب محسوس کرتا ہوں، علاوہ ازیں ان کی شاعری کا گلدستہ پیش کرنا میرا مقصد قطعی نہیں کیونکہ یہ کام بہت ہو چکا ہے میں صرف ان کے اشعار کی بُوباس کو حواس کے حوالے کر رہا ہوں۔

ان کی غزل زندگی کی طرف کھلنے والا ایک دروازہ ہے، خوشیوں نامرادیوں کا ایک جزوِلازم ہے، ان کی غزلوں کے اندرونی جذبے لفظوں کے دریا سے اٹھتے ہوئے چھچھورے جھاگ نہیں ہیں بلکہ دریا کے وجود سے متصل وہ لہریں ہیں جنھیں خود دریا بھی ڈبونے کی ہمت

نہیں کرسکتا۔ فنّی روایت کے احترام کے نام پر اسلاف کی ہڈیوں سے قطرۂ مے نچوڑنے کا کام ذرا بھی ان غزلوں کے خالق نے نہیں کیا۔ نہ لسانی سطح پر نہ معنوی سطح پر تاہم ناسٹلیجیا کی حد تک اس نے بچھڑے ہوئے رنگ و بو کو ضرور یاد کیا ہے اور اکثر یادوں کے الاؤ پر ٹھٹھری ہوئی خاندانی پرچھائیوں کو متحرک کیا ہے اور کہیں کہیں وجدانی اکتساب بھی چاہا ہے۔ خوشی کی بات یہ کہ بشیر بدؔر نے شاعری کو کتبوں اور مجسّموں میں تحلیل نہیں کیا ہے بلکہ زندہ جذبوں کے تجسیمی عمل میں زندگی کے خونِ گرم کو رواں کیا ہے۔ کہیں قصہ گوئی کے دلچسپ فن سے، کہیں نا معلوم سے معلوم تک، کہیں معلوم سے نا معلوم سمت تک کے سفر سے انھوں نے شاعری کو حیاتِ ہمہ جہت کی پائندہ تفسیر بنانے کی مثبت سعی کی ہے:

میں شاہراہ نہیں راستے کا پتھر ہوں
یہاں سوار بھی پیدل اُتر کے چلتے ہیں

بھٹک رہی ہے پرانی دُلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دُھوپ ہوں کبھی دُھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

مری ہنسی سے اُداسی کے پھول کھلتے ہیں
میں سب کے ساتھ ہوں لیکن جدا سا لگتا ہوں

تمام رات چراغوں میں مسکراتی تھی
وہ اب نہیں ہے مگر اُس کی روشنی میں ہوں

اِک زباں جس کو غزل کہیے وہ مجرم ٹھہری
شاہزادی کو چُنا جائے گا دیواروں میں

ان کی غزلوں میں سہلِ ممتنع کی روانی چھوٹی چھوٹی باتوں کے اندر بڑے بڑے

جذبے اور اشیائے معلوم ومحسوس کو ایک تازہ نگاہ سے دیکھنے کی بدولت ایک نئی معنوی یافت کا فن اس قدر حیرت انگیز اور اہم ہے کہ غزل کی قدرِ زوالی ایک قدرِ لازوالی بن جاتی ہے۔ اور غزل کی حدود لامحدودیت تک پھیلتی دکھائی دیتی ہیں۔

ایک غیر عامۃ الورود شاعری کی طرح بشیر بدؔر کی شاعری بھی دو متضاد رویوں کی آئینہ دار ہے۔ ایک طرف تو کسی طفلِ معصوم کی سی ازلی معصومیت ہے اور دوسری طرف افکار و معیار کی بلیغ سطح ہے۔ کبھی کبھی یہ دونوں رویے متصادم بھی ہوئے ہیں لیکن بشیر بدؔر نے اپنی فنکارانہ خلاّقی سے یا معتدل شخص کی تعمیر کے لیے ان کو متصادم ہونے کے باوجود مجروح ہونے سے بچایا ہے۔ جس سے غیر و شر سے مرکب انسانی فطرت کی وہ حقیقی تصویر کشی ہوئی ہے کہ جذباتیت اور عقلیت دونوں کے صحیح مقام اور وجودِ اصلی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بچہ اختر الایمان کی 'یادیں' میں بھی ہے لیکن وہ سفر خواب سے خواب تک کا ہے۔ بشیر بدؔر نے اس بچّے کو تینوں زمانوں پر پھیلا کر جزوِ کو کل کا مرتبہ دیا ہے۔ یہ کیفیت بہت ہی دلآویز اور غیر معنوی ہے:

جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی
تم کو اسکول کی وہ دُعا یاد ہے

شام گہری ہوئی اور گھر دُور ہے
پھول سوجائیں گے راستہ دیکھ کر

بشیر بدؔر کو یہ متعصب مشورہ ضرور دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی غزل کے گلستانِ مقبولیت میں اس شدّت سے پھول نہ مہکایا کریں کہ مشامِ جاں اُداسی کی خوشبوئیں بکھیرنے لگے۔ انھیں اپنے اشعار کی فراوانی کو کلاسیکی انضباط کی طرح زیادہ منتخب بنانا ہوگا تاکہ ان کے اندر کا معیاری شاعر ہمہ اوقات اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے آئے۔ انھوں نے گذشتہ ربع صدی میں کائنات کے کرب اور خوشی، فتح اور کامرانی کو نادر البحر استعاروں اور نادر تشبیہوں کے توسط سے جس طرح سمیٹنے کی کامیاب سعی کی ہے اس لیے ان کی آئندہ غزل سازی میں بھی اسی موٗثر عمل کی قوی اُمید ہے جو ہفت رنگ شاعری کا ایک وسیع دائرۂ کار ہے، 'سچا ادب' اور 'جھوٹا ادب' کے بیچ بشیر بدؔر نے جو دیوار اٹھائی ہے اس سے بشیر بدؔر کی

غزلوں میں ایک وقیع احتساب بھی ہے اور غزل کی نئی میزان کی اہمیت کا تصور بھی۔

بشیر بدؔر کی خطرناک حد تک جو مقبولیت ہے اس کی وجہ ان کی 'مجلسی شہنشاہیت' یا تدریسی تجربہ نہیں ہے بلکہ ان کی غزلوں میں ہمیں اپنا جیسا ہی گوشت پوست کا وہ عام زمینی انسان نظر آتا ہے جو ہماری ہی طرح دُکھوں کے بوجھ سے دَبا ہوا ہے، اُمید و آرزو کے سرابوں کے پیچھے سرگرداں ہے اور ہمارا جیسا ہی تنہا تنہا، بکھرا بکھرا، اکیلا اور اندر سے ٹوٹا پھوٹا ہے، اس کی اُمنگیں، آرزوئیں، بے تاب اندیشے، مایوسیوں سے بھری پڑی تنہائیاں سب کی سب ہمارے اپنے ہی وجود کی شناخت ہیں۔ اس سچّے انسان سے اس کی اپنی اصل شخصیت سے ہم جس طرح ایک لمحہ بھی جدا ہونے کا تصوّر نہیں کر سکتے اسی طرح جدید شاعری بھی بشیر بدؔر کی غزلوں سے الگ اپنا مکمل وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔

OO

□ فیّاض رفعت

بشیر بدؔر کی غزل

بشیر بدؔر کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کی ترتیب و تنظیم میں ایلسوپ (Allsop) کی اینگری ڈکیڈ (Angry Decade) سے کوئی استفادہ نہیں کیا گیا اور نہ ٹوینٹتھ سنچری ویوز (20th Century Views) کو بنیاد بنا کر مفروضوں اور اندیشوں کی دنیائیں آباد کی گئی ہیں۔ برٹش کاؤنسل لائبریری کا بھی خادم ممبر نہیں ہے جہاں انگریزی کتابوں کی فہرستوں اور ان کے اشاریوں سے استفادہ کر کے لوگ خاصے اونچے نقادوں کی ٹیڑھی صفوں میں آگے پیچھے شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک سیدھا سادہ مطالعہ ہے۔ اس مطالعہ میں بشیر بدؔر کی شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ قطعی طور پر مکمل نہیں اس لیے کہ ادب و شاعری میں قطعیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ حوالوں میں کہیں کہیں کلینتھ بروکس (Cleaneth Brooks) اور آئی.اے. رچرڈس (I.A. Rechards) کا نام اگر آئے تو چونکئے نہیں کہ ادھ کچرے نقادان کی تنقیدوں کے معترف نہیں اور جدیدیت اور نمودیت کے شوق میں انھیں خارج از بحث قرار دے چکے ہیں۔ آیئے اب بشیر بدؔر کی شاعری کا کچھ ذکر ہو جائے:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اِک شہر میں قاتل رہا ہے

مظہر جاں جاناں نے یہ کس Context میں کہا تھا یہ جاننا اور پتہ لگانا کسی خالص محقق کا کام ہے میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ ذہن میں اس شعر کے آتے ہی بشیر بدر کا چہرہ اُبھرنے لگتا ہے۔

اس سرزمین پر جہاں شاعروں کی بھرمار ہے، بشیر بدؔر کا دم غنیمت ہے۔ علی گڑھ میں بشیر بدؔر سے میری ملاقات کب ہوئی، مجھے یاد نہیں، مگر رسالوں میں ان کا نام بہت پڑھا تھا

اور انھیں جان گیا تھا۔ شاید 57-58 میں ان کی غزلیں خوب چھپنے چھپانے لگی تھیں۔ ان دِنوں مجھے ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی ’غزلوں‘ سے بے حد لگاؤ تھا۔ دھیرے دھیرے بشیر بدؔر کی بھی امیج بنتی گئی۔ موجودہ دور میں، میں جذبؔی کو غزل کا امام مانتا ہوں، ان کے بعد فیضؔ، مجروؔح اور فراقؔ کو محترم سمجھتا ہوں، ان کے بعد غزل کے قافلے میں بشیر بدؔر، زبیؔر رضوی، شہریاؔر، راج نرائن رازؔ، کمارؔ پاشی، مخمورؔ سعیدی، بمل کرشن اشکؔ اور محمد علویؔ شامل ہیں۔ غزل کے اچھے مزاج داں بشیر بدؔر ہیں اس لیے کہ شعر و شاعری نہ تو پتّے بازی کا فن ہے اور نہ نٹوں کی طرح رسّی پر چلنے کا۔ شاعری کو چیستاں بھی نہیں ہونا چاہیے۔

شاعری میں مزاحیت پسندی اور مجہولیت کے رجحانات کو بھی فروغ نہیں دینا چاہیے۔ شاعری کو محض ذات کے خانوں میں محصور نہیں کیا جاسکتا۔ صرف فرد کے تنہائی کے اظہار کا نام بھی شاعری نہیں۔ شاعری کبھی نئی پرانی نہیں ہوتی، شاعری اچھی بُری ہوسکتی ہے اور اچھی شاعری بے معنی نہیں ہوتی۔ غالبؔ کا کہا آج بھی اٹل ہے کہ شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں اور شاعری میں غزل کی بڑائی سے کوئی کافر ہی انکار کرسکتا ہے، اس لیے کہ غزل جذبات کی تہذیب و رفعت کا نام ہے۔ غزل محض ایک صنفِ سخن کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مخصوص ذہنی رویّے کی غماز بھی ہے۔ ورنہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کی اصطلاح میں پیش کرنا ممکن نہ تھا۔ اگر شاعری کا تعلق جذبہ انگیز معنی سے ہے تو اس جذبہ انگیز معنی کی تلاش بھی غزل میں کی جاسکتی ہے۔

بشیر بدؔر بہت پیارے غزل گو ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ حسرؔت، فانؔی اور جگرؔ جیسی غزل نہیں کہہ سکے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ جذبی مجروح، سرداؔر اور مجاؔز کی طرح قادرالکلام شاعر بھی نہیں مگر ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ روایت سے ان کا رشتہ مضبوط ہے اور عصری تقاضوں کا انھیں احساس ہے، اسی کے ساتھ نئی تبدیلیوں پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ دل جمعی اور لگن کے ساتھ شعر کہہ رہے ہیں اور اگر اسی طرح ریاضت سے کام لیتے رہے تو اپنی منزل پالیں گے۔ میرے نزدیک ان کے یہاں اظہار سے مراد محض اندازِ بیان نہیں بلکہ طرزِ احساس، انتخابِ موضوع، اندازِ نظر اور انتخابِ الفاظ وغیرہ ہے۔ گوئٹے کے نزدیک بھی آرٹ کا اعلیٰ ترین مقصد بیان کی انفرادیت قائم کرنا ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے:

Individuality of expression is the beginning and end of all art.

مثلاً بشیر بدرؔ کے یہ اشعار:

بھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے
کسی کا چہرہ، کسی کے بدن میں جوڑ دیا

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

دل کی بستی بھی شہر دلّی ہے جو بھی گزرا ہے اس نے لوٹا ہے

روشنی کے مقدر میں نیندیں کہاں، چاند میں طاق پر وہ سجائیں کہیں
ہم چراغِ وفا، جلنا ہے رات بھر آسمان تا زمیں وہ جلائیں کہیں

اِک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

چلتے مضمونوں کے نوٹس، اور ترجمے
اُجلے شوکیس میں سج گئے، ٹھیک ہے
کیوں دُکاندار رکھے کتابِ ادب، جب
اسے کوئی اب پوچھتا تک نہیں

تیرے لب کی مہک، میرے بازو کا بل
تیری آنکھوں کا رس، میرے ہاتھوں کا جس
سالہا سال سے جنس بازار ہے صاحبِ نقد بولی لگاتے رہے

پتھروں کی زمین، پتھروں کے شجر، پتھروں کے مکاں، پتھروں کے بشر
کب سویرا ہوا ہم کدھر کو چلے، کس گلی شام آئی، کہاں سوگئے

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے   کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے
سمیٹو اور سینے میں چھپالو   یہ سنّاٹا بہت پھیلا ہوا ہے

چھوٹی سی تھیلی کو دکھا کر اِک سوداگر نے یہ کہا
صدہا شاعر مل جائیں گے اتنے کم دیناروں میں

بشیر بدؔر کے ان شعروں میں انفرادیت ہے اور بے پناہ صداقت بھی بلاشبہ انھوں نے الفاظ کے رنگوں سے دلنشیں نگارخانے سجائے ہیں۔ ان کے شعروں میں خلوصِ غم کی شدّت ہے جس میں شدّتِ احساس (Intensity of Feelings) سے تعبیر کرتا ہوں مثلاً ان کا یہ شعر ہے:

شام آتی تھی اپنے ساتھ لیے ساتھ لیے تیری یادوں کے جلتے بجھتے دیے
شام کیا اب تو ساری ساری رات آگ میں روشنی نہیں ہوتی

اب ہر طرف دُھواں ہے سلگتی حیات کا
باتوں میں رس نہیں رہا، ہاتھوں کے جس گئے

امیجری اور طنز و تضاد شاعری کی بنیاد ہیں۔ کلینتھ بروکس نے اپنے ایک مضمون The Language of Paradox میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ تضاد کی زبان شاعری کے لیے ناگزیر ہے۔ شاعر جس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہے وہ اکثر تضاد کی زبان میں ممکن ہے۔ ٹی. ایس. ایلیٹ بھی ادبی مواد کی تنظیم امیجری پر خاص زور دیتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری بھی تشبیہ و استعارے کے معنی آفرینی اور حسن آفرینی کے قائل ہیں، نہ صرف امیجری کے اعتبار سے۔

بشیر بدؔر کے شعر خوبصورت ہیں بلکہ طنز و تضاد کی زبان کو بھی انھوں نے تابانی بخشی:

عقل کی لشکری آ ہنی آ ہٹیں ، پتھرا گئیں خوشبوؤں کی دُکان
دل کے بازار میں خاک اُڑنے لگی، ڈر کے یادوں کے سوداگراں سو گئے

جنس دل پہلے بھی کیا گراں مایہ تھی اور اب اس ترقی معکوس میں
سنگ ریزوں کے تاجر مرے دور میں آئینہ ساز و شیشہ گراں ہو گئے

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

بشیر بدؔر کے یہاں خیام کی لذت پرستی (Bedonism) نہیں، بلکہ لذت آزار ہے اور وہ اس لذت آزار سے محظوظ ہونا جانتے ہیں:

گاہ پانی ، گاہ شبنم اور کبھی خوں آب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

اب تو انگاروں کے لب چوم کے سو جائیں گے
ہم وہ پیاسے ہیں جو دریاؤں کو ترسائیں گے

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر
عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا

شاید مرے آنسو سے اس کا کوئی رشتہ ہے
تپتے ہوئے صحرا میں جو پھول اکیلا ہے

حالانکہ بشیر بدؔر نے کلاسیکی روایت کا ساتھ چھوڑا مگر اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری

میں بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں کے زوال کا پتہ بھی ملتا ہے۔شہری زندگی کے بے پناہ ہنگاموں کی وجہ سے فرد کی یہاں جو تشنگی احساس ہے شدت انتشار اور خوف وحُزن پیدا ہو چکے ہیں۔ شاعر کے ذہن ودل پر ان کا گہرا اثر ہے۔جس کا اظہار بے ساختہ اور برملا ہوا ہے:

چاند سورج کے آنے جانے سے کچھ کمی زیادتی نہیں ہوتی
شہر میں دن کے وہ علاقے ہیں جن میں اب رات ہی نہیں ہوتی

اب روئے کہاں ساون اب تڑپے کہاں بادل
آنگن نہ بغیچہ ہے ایک چھوٹا کمرہ ہے

دماغ بھی کوئی مصروف چھاپہ خانہ ہے
وہ شور جیسے کہ اخبار چھپتا رہتا ہے

صبح بستر بند ہے جس میں لپٹ جاتے ہیں ہم
اِک سفر کے بعد پھر کھلتے ہیں آدھی رات کو

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سب مشینیں ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن ، نہ کوئی مرد ہے

بارشیں ، چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جوان کمروں کے اندر برسے

شہر نگار ، میری خاطر اُداس مت ہو
آبِ رواں بھی بے گھر ،خوشبو بھی بے وطن ہے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

گلیاں گھپ ہیں، میداں چپ ہیں اور وہ دیوانہ بھی نہیں
مٹی کا دل بیٹھ گیا ہے کس کی آج اُٹھی ہے مٹی

میں ٹھہرا مٹی کا مادھو جا دیوانی راہ لے اپنی
تو سونے چاندی کی مورت خود کو کیوں کرتی ہے مٹی

بزم و بازار میں ہر جا ٹھہرا   دل اکیلا تھا، اکیلا ٹھہرا

چاہے آنکھوں کی روشنی لے لو   آنسو آج رات بھر چمکو

کوئی بیمار کے قریب رہو   شام ہی سے چراغ سوئے ہیں

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے   خود راہ بنا لے گا، بہتا ہوا پانی

ہمارا دل سویرے کا سنہرا جام ہو جائے
چراغوں کی طرح آنکھیں جلیں جب شام ہو جائے

بعض اعتبار سے میں بشیر بدرؔ سے اتفاق نہیں کرتا۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے۔ جو میرے لیے خاصی اجنبیت لیے ہوئے ہے مثلاً:

سانپ کے بوسے میں کیا پیار تھا کہ فاختہ
پھڑپھڑا کر اِک صدائے آسمانی ہوگئی

جیسے جیسے عمر بھیگی سادہ پوشاکی گئی
سوٹ پیلا ، شرٹ نیلی ، ٹائی دھانی ہوگئی

شیشے کی سلائی میں کالے بھوت کا چڑھا
بام کاٹھ کا گھوڑا ، نیم ، کانچ کی گولی
وہ نہیں ملی ہم کو ہک، بٹن ، سرکتی جین
زِپ کے دانت کھلتے ہی آنکھ سے گری چولی

شعری خیال مکمل ابلاغ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ درست ہے مگر شاعر کو ارادی ابہام سے گریز کرنا چاہیے۔ مشہور نقاد اور فلفی T.E. Hulme نے بھی ارادی ابہام کی مذمت کی ہے اور اسے غیر فنی قرار دیا ہے اور زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، بشیر بدؔر سمجھدار آدمی ہیں۔

مجموعی طور پر بشیر بدؔر کی شاعری زندگی کی قوس قزح کی اکائی ہے، جس میں انسانی کیفیات اوراحساسات کے رنگ جھلملاتے ہیں۔ ان کے شعروں میں جو غنائیہ نظم وضبط ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے آہنگ سے پوری طرح واقف ہیں۔ یہی نہیں بشیر بدؔر تخیل کی قوت سے اور لفظ و معنی کے ایجاز واختصار سے وہ کام لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے جذبات بیدار ہوجاتے ہیں اوراس کے یہاں ایک ایسی طرب انگیز تھرتھراہٹ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ شعر کی رنگین وادیوں میں کھوتا چلا جاتا ہے اوران رنگین وادیوں سے جب وہ ڈوب کر اُبھرتا ہے تو اس کے سامنے ایک گہری اور ہمہ گیر معنویت کے چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

OO

بشیر بدؔر مشاہیر کے نظر میں

- ''ڈاکٹر بشیر بدؔر پیارے شاعر ہیں اور اتنے ہی پیارے انسان بھی ہیں۔ جب بھی مشاعرے لوٗٹتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے، کیونکہ ہر دلعزیزی میں جو عوامی جہت شامل ہے، ہمارے دور میں اس کا رشتہ لسانی نوعیت کا بھی ہے، یعنی کہ اُردو کو دوسری علاقائی زبانوں سے جوڑتا ہے اور اس کی بڑی ضرورت ہے۔ بشیر بدؔر کی غزل کی داد بڑے بڑے پارکھیوں نے دی ہے، میں تو کسی شمار و قطار میں نہیں۔ بس ایک ادنی مداح ہوں، جو خوش رنگ تتلی دیکھتا ہے، تتلی ہوا میں اُڑ جاتی ہے لیکن فضا میں رنگ بکھر جاتا ہے جیسے کسی کے بالوں میں کوئی خوبصورت فیتہ چمک جائے یا کاندھے پر کوئی گلابی شال لہرا اُٹھے۔ زندگی کی اس خوبصورتی کو حواس میں بسا لینا اور دوسروں کو منتقل کرنا ایک عبادت بھی ہے اور سماجی خدمت بھی۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ

- ''بشیر بدؔر کی شاعری حد درجہ مانوس و محسوس جذبوں کی شاعری ہوتے ہوئے بھی، غیر مانوس اور اجنبی جذبوں کی شاعری لگتی ہے، کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ ان جذبوں کو عام انسانی سطح پر محسوس تو سب نے کیا ہے لیکن انھیں لفظوں کا پیکر دے کر نطق آشنا کرنے اور جزوِ شاعری بنانے کی توفیق کسی کسی کو ہوئی ہو۔ بشیر بدؔر کی غزل سنیے اور پڑھیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف شاعر کے دل کی آواز نہیں، ہمارے دل کی بھی آواز ہے لیکن جب حافظے اور مطالعے کی مدد سے پیچھے مڑ کر دیکھیے اور کئی صدیوں پر محیط اُردو غزل کے اُفق پر نگاہ دوڑایئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے قریب اور سامنے کی باتیں، اب تک ہمارے یہاں اَن کہی رہ گئی تھیں۔ مانوس اجنبیت کا یہی اچانک پن اور غیر مانوس اپنائیت کا یہی چونکا دینے والا بانکپن بشیر بدؔر کی غزل کا خاص نشان ہے۔

بالکل اسی طرح کا نیا پن اور ذائقہ اب سے چالیس سال پہلے، اُردو غزل کو فراقؔ گورکھپوری کے لہجے نے دیا تھا۔ فراق کا یہ نیا پن اور ذائقہ ہندو کلچر اور مسلم ثقافت کی باہم پیوستگی پر مغربی خیالات کی صیقل سے عبارت تھا۔ بشیر بدؔر نے اس میں تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی معاشرتی و تہذیبی زندگی کا رَس گھولا، ارضیت و مقامیت کے نئے رنگ بھرے، اور جدیدیت کے نام پر اُبھرتی ہوئی شعری روایت سے منسلک کر کے، اُردو غزل کو ایک اور تازہ لہجہ دے دیا۔ ایسا لہجہ جو اس وقت بشیر بدؔر کی پہچان بھی ہے اور اُردو غزل کا مان بھی۔''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

● ''گزشتہ دس بارہ سال سے بشیر بدؔر کی غزلیں 'نیا دَور' میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کی غزلیں پہلی بار 'نیا دَور' میں اشاعت کے لیے آئی تھیں تو ان کے لہجے کے چونکا دینے والے نئے پن نے جس میں احساس و فکر دونوں تازہ تازہ سے تھے، مجھے متاثر کیا تھا۔ شعر پڑھتے وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑنے کا احساس ہوا تھا۔ اس غزل میں دو چیزیں تھیں، اپنے زمانے کا احساس اور دوسرے اپنی روایت سے گہری وابستگی۔ یہی خصوصیت ان کی ساری غزلوں میں رنگ بھرتی رہی ہے۔ شروع کی غزلوں میں ان کے ہاں تجربہ سمٹ کر آتا ہے۔ بعد کی غزلوں میں یہ تجربہ پھیلتا نظر آتا ہے۔

بشیر بدؔر کی آواز میں ایک نیا پن ہے۔ ان کے ہاں نغمگی بھی ہے اور عہد حاضر کی آواز بھی، ان کے لہجے میں دل کو موہ لینے والی ایک ایسی جاذبیت ہے کہ یہ مجموعہ جدید اُردو غزل میں قابلِ ذکر اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی

● ''ہندوستان کی دوسری زبانوں میں غزل کے لیے جو محبت اور عزّت پیدا ہوئی ہے اس میں بشیر بدؔر کا نمایاں حصہ ہے۔ بشیر بدؔر کی شاعری معمولی شاعری نہیں ہے وہ زندگی کے تفکر کو غزل بناتے ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ اچھی شاعری کر کے مقبول ہیں۔ میرے نزدیک اس وقت ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر اُردو غزل کی آبرو بشیر بدؔر ہیں۔''

پروفیسر خلیق انجم

● ''ہندوستان میں بشیر بدؔر کے علاوہ میں صرف حسن نعیمؔ اور باقیؔ کا دلدادہ ہوں لیکن ان کی

دُنیا محدود ہے۔ شہریار بھی ایک نقطے پر ٹھہرے ہوئے ہیں، بشیر بدؔر کے یہاں پھیلاؤ بھی ہے اور نمو بھی۔"

پروفیسر قمر رئیس

- "بشیر بدؔر کی غزل ہمارے ذہن اور روح میں رَچ بس گئی ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب میرٹھ کے فسادات میں ان کے لیے ایک بہت بڑی افواہ ہم تک پہنچی، اس وقت میری طرح ہزاروں غیر اُردوداں لوگوں کی بھی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ مجھے ان کی خوبصورت شاعری، شعر پڑھنے کا انداز اور تہذیبی سعادت مندی اس درجہ بے قرار کر گئی تھی کہ میں وہ درد کا تاثر آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔"

حیات اللہ انصاری

- "بشیر بدؔر کی غزلیں آج کی ذہنی زندگی اور تہذیبی فضا کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں پیش کرتی ہیں۔ ان کی غزلیں تازہ ہوا کے ایک نرم جھونکے کی طرح ذہن چھوتے دل میں اُتر جاتی ہیں۔"

مخمور سعیدی

- "جانِ غزل، میں غزل میں فراقؔ گورکھپوری اور ناصؔر کاظمی کے بعد بشیر بدؔر کو ہی مانتا ہوں۔"

محمد علوی

- "بشیر بدؔر کی غزل پڑھتے ہوئے میں نے ہر لفظ کا منفرد ذائقہ محسوس کیا ہے۔ کھردرے سے کھردرے اور غزل سے باہر الفاظ بھی ان کے اشعار میں نرم، میٹھے اور سچے لگتے ہیں۔"

کمار پاشی

- "غزل گو کی حیثیت سے بشیر بدؔر کی صلاحیتوں پر ایمان نہ لانا کفر ہے۔"

پروفیسر محمد محسن

- "آپ کے ہاں وہ گہرائی اور نکھار صاف اُبھر آتا ہے جس کی مجھے آپ سے توقع تھی۔ آپ دَبے پاؤں اپنے انداز اُترتے چلے گئے ہیں اور اب آپ کی غزل میں وہ کسک پیدا ہو گئی ہے جس کے بغیر اعلیٰ شاعر کا تصور محال ہے۔"

وزیر آغا

- ''بشیر بدؔر کی غزل اپنی لفظیات اور منظر نامہ کے اعتبار سے ایک نرالی شان رکھتی ہے۔''

پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی

- ''بشیر بدؔر کا اپنا ایک خوبصورت لہجہ ہے وہ زندگی کی رنگا رنگی تہداریوں کو اپنے مخصوص تجزیاتی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں ان کی آواز آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے اور ان کے ہم عصر لکھنے والے ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔''

صلاح الدین پرویز

- ''بشیر بدؔر کا شمار جدید اُردو غزل کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا لہجہ اور وقار عطا کیا ہے۔ عصری مسائل اور زندگی کے پیچیدہ تجربوں کو سادگی اور پرکاری کے ساتھ شعر کا رُوپ دینے میں انھیں کمال حاصل ہے۔''

پروفیسر مغنی تبسّم

- ''بشیر بدؔر اُردو کے جدید ترین شعرا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مروّجہ رسمایات میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے یہاں جزئیات نگاری، عمومی مشاہدات کے ان دیکھے پہلوؤں کی عکاسی اور ایسی نادر پیکر نگاری ہے جو ہمیں چونکاتی بھی ہے اور دعوتِ فکر بھی دیتی ہے اور اپنے اندر طنزیہ غایت بھی رکھتی ہے۔''

اسلوب احمد انصاری

- ''بشیر بدؔر کی آواز زور سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔''

ندا فاضلی

- ''میں نے بشیر بدؔر کی غزل کو زندگی کے دُھوپ اور احساس کے پھولوں کی غزل کہا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا بنیادی مزاج ہے۔ بشیر بدؔر نے غزل کو جو محبوبیت، وقار، اعتبار اور وجاہت بخشی ہے وہ بے مثال ہے، عالمی سطح پر بشیر بدؔر سے پہلے کسی کو یہ محبوبیت نہیں ملی۔ میر غالب کے شعر بھی مشہور ہیں لیکن میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ عالمی پیمانہ پر بشیر بدؔر کی غزلوں کے اشعار سے زیادہ کسی کے شعر مشہور نہیں ہیں وہ اس وقت دنیا میں غزل کے سب سے محبوب شاعر ہیں۔''

ابوالفیض سحر

- ’’اب جدید غزل گوان کی (بشیر بدؔر) کی تقلید کر رہے ہیں۔‘‘

وحید اختر

- ’’بشیر بدؔر نے اُردو غزل کو ایک ایسی انفرادیت، دلآویزی اور تازہ کاری سے روشناس کرایا ہے جو صنفِ غزل کی حدود میں بڑا کٹھن کام تھا اور یہ وہ اوصاف ہیں جو ہمارے دَور کے بہت کم شعرا کے حصے میں آئے ہیں۔‘‘

بلراج کومل

OO

اتیج

☼

سنو پانی میں یہ کس کی صدا ہے
کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے

سویرے میرے ان آنکھوں نے دیکھا
خدا چاروں طرف بکھرا پڑا ہے

اندھیری رات کا تنہا مسافر
مری پلکوں پہ اب سہما ہوا ہے

سمیٹو اور سینے میں چھپالو
یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہوچکا ہے

ہماری شاخ کا نوخیز پتّہ
ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے

مجھے ان نیلی آنکھوں نے بتایا
تمھارا نام پانی پر لکھا ہے

☼

دہکتی دُھوپ سمندر ہے، یہ جزیرے ہیں
گھنے درخت جو سڑکوں پہ سایہ کرتے ہیں

عجیب شہر ہے یہ اس کے آسمان پہ بھی
لہو میں ڈوبے ہوئے سرخ سرخ کپڑے ہیں

وہ کوئی اور تھا شب خون مارنے والا
ہمیں نہ مارو کہ ہم بے ضرر فرشتے ہیں

یہ پتھروں کا ہے جنگل چلو یہاں سے چلیں
ہمارے پاس تو گیلی زمیں کے پودے ہیں

عرق نچوڑنے والی مشین پیاسی ہے
ابھی ہمارے بدن سبز کچّے کچّے ہیں

پھر ان کے نیچے درندوں کے نام کس نے لکھے
ہمیں یقین ہے یہ سب ہمارے چہرے ہیں

عظیم دُشمنو چاقو چلاؤ موقع ہے
ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

٭

سبز پتّے دُھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے
اُجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

سُرخ نیلے چاند تارے دوڑتے ہیں برف پر
کل ہماری طرح یہ بھی دُھند میں کھو جائیں گے

دن میں دفتر کا قلم مل کی مشینیں سب کچھ ہیں ہم
رات آئے گی تو پلکوں پہ ستارے آئیں گے

شام تک میلہ ہے پاگل پیڑ پنچھی کس کے میت
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

دل کے ان باغی فرشتوں کو سڑک پر جانے دو
بچ گئے تو شام تک گھر لوٹ کر آ جائیں گے

تنہا طے کرنا ہے سب کو رات کا سارا سفر
جھاڑیوں میں جگنوؤں کے قافلے کھو جائیں گے

☼

اِک پَل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے
پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

یہ رات پھر نہ آئے گی بادل برسنے دے
میں جانتا ہوں صبح تجھے بھول جاؤں گا

مٹّی تری صدا ہوں میں ٹھنڈے ستاروں کی
خاموش ہونٹ چومتے ہی ڈوب جاؤں گا

اس دن بجائے اُوس کے ٹپکے گا سُرخ خون
تلوار لے کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

جب رات کے سپرد مجھے کرنے آؤ گے
رومال روشنی کا ہوا میں اُڑاؤں گا

رہ رہ کے ایک پھول مہکتا ہے خون میں
اس کو بدن کی مٹّی کے نیچے دباؤں گا

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے لڑیں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں میں مسکراؤں گا

☼

اُڑتی کرنوں کی رفتار سے تیز تر، نیلے بادل کے اِک گاؤں میں جائیں گے
دھوپ ماتھے پہ اپنے سجالائیں گے، سائے پلکوں کے پیچھے چھپالائیں گے

برف پر تیرتے روشنی کے بدن، چلتی گھڑیوں کی دو سوئیوں کی طرح
دائرے میں سدا گھومنے کے لیے، آہنی محوروں میں جڑے جائیں گے

جب ذرا شام کچھ بے تکلف ہوئی، برگزیدہ فرشتوں کے پر نُچ گئے
رات کا ٹیپ سورج بجادے اگر، موم کے پاک چہرے پگھل جائیں گے

سرمئی ہڈیوں، خاکی اشجار نے، لوٹنے والوں کا خیر مقدم کیا
ہم نے تو یہ سنا تھا کہ ان لوگوں پہ، چاند تارے بہت پھول برسائیں گے

مختلف پیچ میں اِک کسی شخصیت، یاد کا پھول بن کر بکھر جائے گی
دُھوپ کے چمچماتے ہوئے ہاتھ جب نیم کے پھول سڑکوں پر برسائیں گے

☼

ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا، کھل گئے بادباں لوٹ جا، لوٹ جا
سانولی سرزمین پر میں اگلے برس، پھول کھلنے سے پہلے ہی آجاؤں گا

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اُتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام نے اُٹھ کے بتی جلائی نہیں
روشنی کا فرشتہ بڑی دیر تک دستکیں دے کے واپس چلا بھی گیا

میرے بچپن کے مندر کی وہ مورتی، دھوپ کے آسماں پر کھڑی تھی جہاں
ایک دن جب مراقد مکمل ہوا، اس کا سارا بدن برف میں دھنس گیا

جیسے یہ جانتا ہو طلسمی ہوا اس پرندے کو واپس نہیں لائے گی
خشک ڈنٹھل نے اِک فاختہ کی گھنی بند پلکوں کا اس طرح بوسہ لیا

آسماں کے سنہرے پھلوں کی طرح شہد سے تھرتھراتا تھا اپنا بدن
اِک دن برف زاروں سے دریا چلے، آنسوؤں کا نمک خون میں گھل گیا

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

اَن گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے
فاختہ دُھوپ کے پل پہ بیٹھی رہی رات کا ہات چپ چاپ بڑھتا رہا

☼

کچے پھل کوٹ کی جیب میں ٹھونس کر جیسے ہی میں کتابوں کی جانب بڑھا
گیلری میں چھپی دوپہر نے مجھے ناریل کی طرح توڑ کر پی لیا

پٹریوں پر کھڑے دو نئے ڈبوں نے جس گھڑی طے کیا ہم نہ ہوں گے جدا
سبز پلکیں جھکیں ، دیو آگے بڑھا ، ایک ڈبّہ اکیلا کھڑا رہ گیا

دُھند کی بند پلکیں کترتے ہوئے سائیکل پر چلیں دُھوپ کی قینچیاں
رنگ والی ہواؤں کے کرتے اُڑے صبح کا سائرن دے رہا ہے صدا

بند پلکوں پہ جو پھول رکھ کر کہے آؤ ہم برف کی چوٹیوں پر چلیں
سبز قالین پر دُھوپ میں لیٹی ہوئی سوچتی ہے نہ جانے وہ کب آئے گا

ایک مانوس بے نام کہرے میں سب اپنے اندر ہی اندر سلگنے لگے
اُن کے سینوں پہ جب سرمئی شام نے درد کا پاک لوبان سُلگا دیا

ریشمی بالوں والے کسی پھول کی گرم ٹوپی پھنسی جھاڑیوں میں ملی
سرخ خرگوش کے وہ تعاقب میں گم وادیوں میں اُترتا چلا ہی گیا

✡

پھٹے کاغذوں، چیتھڑوں، زرد پتوں، کتابوں کے اوراق لے کر ہوا سر پٹکتی چلی جا رہی ہے
یہ دونوں کا باہم عجب سلسلہ ہے زمیں کے بدن پر جہاں گھاؤ دیکھا ہوا اس کو بھرتی چلی جا رہی ہے

سبھی کاپیوں اور کتابوں پہ گہری اُداسی جمی تھی، اسے پہلے جھاڑا، کبوتر کا خوں گرم ہونٹوں پہ پھیرا
کلینڈر میں بیٹھے ہوئے سُرخ بلے کی مونچھوں کو چوما اور اب وہ اندھیری سڑک پار کرتی چلی جا رہی ہے

'کھڑی موج' کے لہر کھاتے کٹاؤ کے نیچے بندھی زرد ساری کے اوپر عجب جان لیوا سا حصہ کھلا ہے
یہ پسماندہ قصبے کی پتلی سڑک، پر ٹریفک رُکا ہے (سپاہی کرے کیا) بہت بھیڑ بڑھتی چلی جا رہی ہے

یہ کیسی صدا ہے جوان دُھوپ کھاتی ہوئی مکھیوں کو بلاتی ہے آؤ کبھی جھاگ کے ان پہاڑوں میں آؤ
گھلے صابنوں کی مہکتی ندی میں کبھی تم بھی آؤ تبھی یہ لہکتی بہکتی چلی جا رہی ہے

مرے پاؤں اسٹیل، سینہ سڑک ہاتھ لکڑی کے جنگلے، گزرتے ہیں جن پر ٹرک ریل، موٹر، بسیں بیل گاڑی
مگر اب یہ محسوس ہوتا ہے مجھ کو کہ کچھ دن سے پانی مجھے کاٹتا ہے زمیں اپنے اندر ہی دھنستی چلی جا رہی ہے

میں آنچل کا سایہ کھلے آنگنوں، اونچی دیوار و دَر چھت شجر اور پہاڑوں سے ہوتا خلا کا مکیں ہو رہا ہوں
طلب تھی کہ اس پھیلتے اور سمٹتے بدن کو میں بانہوں میں بھر لوں مگر دُھوپ کیسی سرکتی چلی جا رہی ہے

☼

صبح کا جھرنا ہمیشہ ہنسنے والی عورتیں
جھٹپٹے کی ندّیاں خاموش گہری عورتیں

معتدل کردیتی ہیں یہ سرد موسم کا مزاج
برف کے ٹیلوں پر چڑھتی دُھوپ جیسے عورتیں

سبز ، نارنجی ، سنہری ، کھٹی ، میٹھی لڑکیاں
بھاری جسموں والی ٹپکے آم جیسی عورتیں

سڑکوں، بازاروں، مکانوں، دفتروں میں رات دن
لال ، پیلی ، سبز ، نیلی جلتی بجھتی عورتیں

شہر میں اِک باغ ہے اور باغ میں تالاب ہے
تیرتی ہیں اس میں ساتوں رنگ والی عورتیں

سیکڑوں ایسی دُکانیں ہیں جہاں مل جائیں گی
دھات کی ، پتھر کی ، شیشے کی ، ربر کی عورتیں

منجمد ہیں برف میں کچھ آگ کے پیکر ابھی
مقبروں کی چادریں ہیں پھول جیسی عورتیں

ان کے اندر پک رہا ہے وقت کا آتش فشاں
کن پہاڑوں کو ڈھکے ہیں برف جیسی عورتیں

آنسوؤں کی طرح تارے گر رہے ہیں عرش سے
رو رہی ہیں آسمانوں کی اکیلی عورتیں

غور سے سورج نکلتے وقت دیکھو آسماں
چومتی ہیں کس کا ماتھا اُجلی لمبی عورتیں

فاختائیں ، تتلیاں ، مچھلی ، گلہری ، بلیاں
زندگی میں آئیں اپنی کیسی کیسی عورتیں

سبز سونے کے پہاڑوں پر قطار اندر قطار
سر سے سر جوڑے کھڑی ہیں لانبی لانبی عورتیں

اِک غزل میں سیکڑوں افسانے، نظمیں اور گیت
اس سراپے میں چھپی ہیں کیسی کیسی عورتیں

واقعی دونوں بہت مظلوم ہیں نقّاد اور
ماں کہے جانے کی حسرت میں سلگتی عورتیں

☼

چل مسافر ، بتّیاں جلنے لگیں
آسمانی گھنٹیاں بجنے لگیں

کھل رہا ہے شام کا کالا گلاب
زرد سوکھی پتّیاں جھڑنے لگیں

سرخ ، دھانی ، سبز ، نیلی ، دُودھیا
شام آئی پتّیاں جلنے لگیں

دن کے سارے کپڑے ڈھیلے ہو گئے
رات کی سب چولیاں کسنے لگیں

رات اِک تالاب کے آئینے میں
جھلملاتی کشتیاں چلنے لگیں

ڈوب جائیں گے سبھی دریا ، پہاڑ
چاندنی کی ندّیاں چڑھنے لگیں

بند کرلو در ، دریچے ، کھڑکیاں
پھر ہوا میں سیٹیاں بجنے لگیں

جامنوں کے باغ پر چھائی گھٹا
اودی اودی لڑکیاں ہنسنے لگیں

شاخ تھی کمزور شاید اس لیے
پتّیوں پر پتّیاں مرنے لگیں

رات کی تنہائیوں کو سوچ کر
چائے کی دو پیالیاں ہنسنے لگیں

دوڑتے ہیں پھول ، بستوں کو دبائے
پاؤں پاؤں تتلیاں چلنے لگیں

لہو پکارتا ہے روشنی کے پیکر دے
زمینیں چیخ رہی ہیں ہمیں پیمبر دے

یہ آب سیدھا چلا جا رہا ہے بڑھتا ہوا
کوئی چٹان بنے سینہ سامنے کر دے

کہاں سے ذہن میں اِک دم مرے خیال آیا
گلاس خالی ہے اس میں کوئی لہو بھر دے

ذرا سا سر ہے مگر اس میں ایک صحرا ہے
اسی طرح مری آواز کو سمندر دے

تمام تاروں کو چھوتا ہوا گزر جاؤں
کمان بن کے مجھے تیر سا رواں کر دے

یہ اب کی خود پہ گرا کر شہید ہو جائیں
خلا میں بھی ابابیلوں کو وہ پتھر دے

اندھیرے کمرے میں سب لوگ اب برہنہ ہیں
کس کا ہاتھ بڑھے اور روشنی کر دے

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پییں
دُعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

☼

اپنی اُداس دُھوپ تو گھر گھر چلی گئی
یہ روشنی لکیر کے باہر چلی گئی

نیلا سفید کوٹ زمیں پہ بچھا دیا
پھر مجھ کو آسمان پہ لے کر چلی گئی

میں نیچے زرد گھاس کے بستر پہ سوگیا
وہ اپنی سرخ کار کی چھت پر چلی گئی

کب تک جھلستی ریت پر چلتی تمھارے ساتھ
دریا کی موج دریا کے اندر چلی گئی

ہم لوگ اونچے پول کے نیچے کھڑے رہے
اُلٹا تھا بلب روشنی اندر چلی گئی

لہروں نے گھیر رکھا تھا سارے مکان کو
مچھلی کدھر سے کمرے کے اندر چلی گئی

اپنی جگہ جمے ہیں کہنے کو کہہ رہے تھے
سب لوگ ورنہ بہتے دریا میں بہہ رہے تھے

ایسا لگا کہ ہم تم کہرے میں چل رہے ہوں
دو پھول اونچی نیچی لہروں پہ بہہ رہے تھے

دل اُجلے پاک پھولوں سے بھر دیا تھا کس نے
اُس دن ہماری آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے

اکثر شراب پی کر پڑھتی تھی وہ دُعائیں
ہم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ رہ رہے تھے

اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی
جھلسے مکان جھوٹے افسانے کہہ رہے تھے

☼

ہوا میں ڈھونڈ رہی ہے کوئی صدا مجھ کو
پکارتا ہے پہاڑوں کا سلسلہ مجھ کو

میں آسمان و زمیں کی حدیں ملا دیتا
کوئی ستارہ اگر جھک کے چومتا مجھ کو

چپک گئے مرے تلووں سے پھول شیشے کے
زمانہ کھینچ رہا تھا برہنہ پا مجھ کو

وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لیے
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اُٹھالیا مجھ کو

مکان ، کھیت ، سبھی آگ کی لپیٹ میں تھے
سنہری گھاس میں اس نے چھپا دیا مجھ کو

دبیز ہونے لگی سبز کائی کی چادر
نہ چوم پائے گی اب سر پھری ہوا مجھ کو

پلا کے رات کا رس راکشش بناتی تھی
سویرے لوگوں سے کہتی تھی دیوتا مجھ کو

تو ایک ہاتھ میں لے آگ ایک میں پانی
تمام رات ہوا میں جلا بجھا مجھ کو

بس ایک رات میں سرسبز یہ زمین ہوئی
مرے خدا نے کہاں تک بچھا دیا مجھ کو

☼

دہکتے نیزوں سے یہ رات حملہ کر دے گی
سجا کے چاند کی کشتی میں میرا سر دے گی

چڑھے گا سوکھے بدن میں لہو کا فوّارہ
یہ سُرخ چاندنی، خالی گلاس بھر دے گی

تھرکتی، مچھلی، نکل کر سرکتے کپڑوں سے
تمام رات کو اب بے لباس کر دے گی

یہ نرم بلی جو سوئی ہے میرے سینے پر
میں سو گیا تو کلیجہ ہی چاک کر دے گی

اسی خیال سے پتھر ہے بیچ پانی میں
کوئی تو موج، گہر کی اُسے خبر دے گی

بہار اب کے لہو کے چڑھے سمندر کو
قلم کئے ہوئے بازو، بُریدہ سر دے گی

بدن کے پیڑ کو خود اس کی شاخ کاٹے گی
یہی تراش زمیں کو نیا شجر دے گی

طواف، دائرے کا پہلی بار ٹوٹا ہے
یہ رہ گزر ہمیں اِک اور رہ گزر دے گی

چڑھا کے پیٹھ پہ بکری کے بچے گھومیں گے
یہ دُنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کر دے گی

☼

ماٹی کی کچی گاگر کو کیا کھونا ، کیا پانا ، بابا
ماٹی کو ماٹی رہنا ہے ماٹی میں مل جانا ، بابا

ہم کیا جانیں دیواروں سے کیسے دھوپ اُترتی ہوگی
رات رہے باہر جانا ہے رات گئے گھر آنا ، بابا

جس لکڑی کو اندر اندر دیمک بالکل چاٹ چکی ہو
اس کو اوپر سے چمکانا راکھ پہ دُھوپ جمانا ، بابا

چھت کے اوپر بادل برسیں، چھت کے نیچے اپنی آنکھیں
تن کی اس گیلی مٹی کو گھل گھل کر بہہ جانا ، بابا

پیار کی گہری پھنکاروں سے سارا بدن آکاش ہوا ہے
دودھ پلانا ، تن ڈسوانا ہے دستور پرانا ، بابا

ان اونچے شہروں میں پیدل صرف دیہاتی ہی چلتے ہیں
ہم کو بازاروں سے اِک دن کاندھے پر لے جانا، بابا

پانی کے ہم جھوٹے موتی کیسے پلکوں پر رُک جائیں
ندی کو دریا ، دریا کو ساگر سے مل جانا بابا

دُھوپ نئی بیل باٹم پہنے سڑکوں کی کشتی پر تیرے
راکھ کا کرتا ، دھول کی لنگی ، اپنا بھیس پرانا بابا

☼

چاند ہاتھ میں بھر کر، جگنوؤں کے سر کاٹو اور آگ پر رکھ دو
موم بتّی کی رانیں جب بلیڈ سے کھل جائیں چاقوؤں کے سر رکھ دو

میں بھی اِک شجر ہی ہوں جس پہ آج تک شاید پھول پھل نہیں آئے
تم مری ہتھیلی پر ایک رات چپکے سے برف کے ثمر رکھ دو

دُھوپ کا ہر بجرا، آگ کے سمندر میں چل پڑا ہمیں لینے
نرم وگرم ہونٹوں سے بند ہوتی پلکوں پر تتلیوں کے پر رکھ دو

چاہے کوئی موسم ہو دن گئی بہاروں کے پھر سے لوٹ آئیں گے
ایک پھول کی پتّی اپنے ہونٹ پر رکھ کر میرے ہونٹ پر رکھ دو

میرا تن درختوں میں اس لیے جھلستا ہے سخت دُھوپ سہتا ہے
کیا عجب تم آنکلو اور میرے کاندھوں پر تھک کر اپنا سر رکھ دو

روز تار کٹنے سے رات کے سمندر میں شہر ڈوب جاتا ہے
اس لیے ضروری ہے اِک دیا جلا کر تم دل کے طاق پر رکھ دو

☼

زمیں سے آنچ زمیں توڑ کر نکلتی ہے
عجیب تشنگی ان بادلوں سے برسی ہے

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے
تمام جسم کے کپڑے اُتار لیتی ہے

ہمارے عہد میں نایاب ہے بچائے رہو
تمھاری آنکھ میں اِک چیز جو چمکتی ہے

سروں پہ دُھوپ کی گٹھری اٹھائے پھرتے ہیں
دِلوں میں جن کے بڑی سرد رات ہوتی ہے

کھڑے کھڑے میں سفر کر رہا ہوں برسوں سے
زمیں پاؤں کے نیچے کہاں ٹھہرتی ہے

ہوا ہمارے ہی سینے میں آئے جائے ہے
بلند چاند ستارے زمین گہری ہے

بکھری رہی ہے مری رات اس کے شانوں پر
کسی کی صبح مرے بازوؤں میں سوتی ہے

پگھل رہی ہے چٹانیں نحیف بانہوں میں
بدن میں پیار کے کیسی عجیب گرمی ہے

ہوا کے آنکھ، نہیں ہاتھ اور پاؤں نہیں
اسی لیے وہ سبھی راستوں پہ چلتی ہے

☼

سب آنے والے بہلا کے چلے گئے
آنکھوں پر شیشے چمکا کر چلے گئے

ملبے کے نیچے آکر معلوم ہوا
سب کیسے دیوار گراکر چلے گئے

اگر کبھی لوٹیں گے راکھ بٹوریں گے
جنگل میں جو آگ لگاکر چلے گئے

میں تھا، دن تھا اور اِک لمبا رستہ تھا
سب خیمے جب لوگ اٹھاکر چلے گئے

چٹانوں پر آکر ٹھہرے دو رستے
پھر آگے اِک راہ بناکر چلے گئے

برف میں رکھی ٹھنڈی بوتل چیک گئی
خوف دِلوں میں لوگ دَباکر چلے گئے

جب دونالی نے رُخ پھیرا سب غازی
اپنے اپنے ہاتھ اٹھاکر چلے گئے

جانے کب ڈونگوں میں مہکیں گے تارے
کتنے سورج ہاتھ دُھلاکر چلے گئے

گارے، چونے، پتھر کے دُشمن دیکھو
آہن کی دیوار بنا کر چلے گئے

پتھر جیسے مچھلی کے کولھے چمکے
گنگا جل میں آگ لگا کر چلے گئے

سات ستارے اُڑتے گھوڑوں پر آئے
پلکوں سے کچھ پھول چُرا کر چلے گئے

دیواریں، دیواروں کی جانب سرکیں
چھت سے بستر لوگ اٹھا کر چلے گئے

کچھ ایسے بچے بھی آئے مکتب میں
نام لکھا یا نام لکھا کر چلے گئے

تتلی بھاگے تتلی کے پیچھے پیچھے
پھول آئے اور پھول چُرا کے چلے گئے

وہ چہرے کیسے تھے جو آرزوؤں سے
ان آنکھوں کو دُھوپ دکھا کر چلے گئے

سردی آئی لوگ پہاڑوں کو بھولے
پتھر پر شیشے بکھرا کر چلے گئے

رات ہوا کے ایسے جھونکے دَر آئے
بھری ہوئی چھاگل چھلکا کر چلے گئے

☼

دھوپ آتی ہے مجھ کو پھیلانے
شامیانہ مرا ، ہوا تانے

پتّے ، موتی ، ہتھیلیوں پر لیے
صبح کو دے رہے ہیں نذرانے

جھومتے پھول ، مانگتے ہیں دُعا
اب ہوا آئے ہم کو بکھرانے

دُھوپ کے اونچے نیچے رستوں کو
ایک کمرے کا بلب کیا جانے

ہاتھ کو ہاتھ چھو نہیں سکتے
انگلیوں کا نصیب دستانے

تیز پہیوں کی دُھول میں ڈوبے
پیڑ تھک کر کھڑے ہیں ستانے

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کاروں پر
گھوڑے، اسکوٹروں کے دیوانے

اُجلے چوہے، نفیس سوٹوں میں
اچھے، لگتے ہیں جیسے افسانے

بلیاں کرسیوں پر آ بیٹھیں
زنگ آلود، چمچے کھنکانے

پھر ہوا میں گلاس لہرائے
دو ستارے اُٹھے ہیں ٹکرانے

رات، بالکل برہنہ لیٹی ہے
بکھرے ہیں چاند تاروں کے دانے

آخری وقت، جب گزرنے لگوں
کچھ بھی میری نظر نہ پہچانے

ایک چڑیا ہے اس کو لے آنا
میرے کانوں میں گیت ٹپکانے

میں اُسے طرح طرح دیکھوں گا
بند آنکھیں سنیں گی وہ گانے

☼

رات کی بدلیاں بکھرنے لگیں
برف کی چوٹیاں چمکنے لگیں

ریت میں آگ دفن ہے شاید
منجمد مچھلیاں پگھلنے لگیں

پھر یہ گلزار ہو نہ جائے کہیں
آگ میں تتلیاں چمکنے لگیں

تلخیوں کی زبان پر اِک رات
برف کی ٹافیاں پگھلنے لگیں

بارکوں میں چہل پہل ہے بہت
وردیاں ، پیٹیاں چمکنے لگیں

بحری قزاق ہوگئے بوڑھے
بے خطر کشتیاں گزرنے لگیں

پیٹھ پر بستروں کو لادے ہوئے
پیڑ سے چینٹیاں اُترنے لگیں

اب سمندر ہماری طرح ہوا
ریت پر سیپیاں سلگنے لگیں

ایک تیزاب ہے نسوں میں رواں
خون میں ہڈّیاں پگھلنے لگیں

☼

سناٹا کیا چپکے چپکے کہتا ہے
ساری دُنیا کس کا رین بسیرا ہے

کیسے آؤں راہ میں ستّر پتھر ہیں
ہر پتھر کے اندر کوئی دریا ہے

آسمان کے دونوں کونوں کے آخر
ایک ستارہ تیرا ہے اِک میرا ہے

ساری رات لحافوں میں روئی آنکھیں
سب کہتے تھے رشتہ ناطہ جھوٹا ہے

انڈا، مچھلی چھو کر جن کو پاپ لگے
ان کا پورا ہاتھ لہو میں ڈوبا ہے

آہستہ آہستہ دل پر دستک دو
دھیرے دھیرے یہ دروازہ کھلتا ہے

سورج کے گھر سے اس کے گھر تک جانا
کتنا سیدھا سادا دھوپ کا رستہ ہے

جسم سویرا ہوتے ہوتے راکھ ہوا
لیکن دایاں ہاتھ ابھی تک سوتا ہے

شعلوں کے کپڑے مچھلی نے پھینک دیے
سُرخ شیڈ میں زہر کا جسم دمکتا ہے

☼

ایسی گڈ مڈ ہوئیں سردیاں ، گرمیاں
آگ کی سسکیوں میں کھلی قلفیاں

دُھوپ میں سُرخ تارے چمکنے لگے
پکّے امرود پر پڑگئیں چتّیاں

صبح کی پسلیوں سے نکلنے لگیں
کرنیں باندھے ہوئے رنگ کی لنگیاں

آگ کی تتلیوں کو اگر چھو لیا
راکھ ہوجائے گا لکڑیوں کا مکاں

☼

رات کے ساتھ رات لیٹی تھی
صبح اِک پالنے میں روتی تھی

یاد کی برف پوش ٹہنی پر
اِک گلہری اُداس بیٹھی ہے

برف کی پیالیوں میں بیٹھا دودھ
بے حسی روز پیتی رہتی ہے

ایک چپ میرے اور اس کے بیچ
رات دیوار بن کے لیٹی تھی

میں یہ سمجھا کہ لوٹ آئے تم
دُھوپ کل اتنی اُجلی اُجلی تھی

کتنے شاداب کتنے دلکش تھے
جب ندی روز ہم سے ملتی تھی

ایک کرتے کے بائیں کاندھے پر
پیار کی سُرخ تتلی بیٹھی تھی

کتنی ہلکی قمیض پہنے ہوئے
صبح انگڑائی لیتے اُٹھی تھی

رنگ سارے اُچٹیوں میں گئے
دُھوپ میں اَلگنی اکیلی تھی

بہتے پانی میں ایک کاغذ پر
روشنائی سی پھیلی پھیلی تھی

توڑ کے بے شمار کر ڈالا
یہ اکائی بہت اکیلی تھی

چھوڑ کر پھول ، پیڑ پتّوں کو
کس لیے تار سے وہ چپکی تھی

لوگوں نے غالباً نہیں دیکھا
دُھوپ میں ایک شمع جلتی تھی

☼

سرمہ ، مسّی ، کنگھی ، چوٹی ، بھولی ہے
سوکھے پتّوں پر جو مینا بیٹھی ہے

کُہرے کے لرزیدہ ہاتھوں میں اکثر
تلسی اور ادرک کی چائے چھلکتی ہے

ساون نے دھرتی پر پھیلا دیں آنکھیں
لیکن میرا چہرہ اب بھی خالی ہے

وہ جو رنگ چمکتا ہے اس ٹہنی پر
ہاتھ آئے تو پھول ، نہیں تو تتلی ہے

شاور کے نیچے گھلتی جاتی ہے شام
میری آنکھوں پر اِک ٹاول لپٹی ہے

تیر رہی ہے آگ کی مچھلی سینے میں
تم سمجھے تھے شاید برف کی برفی ہے

اپنے ہی مرچے ، پودینے سوکھ گئے
ورنہ دُنیا ماش کی دال تو اب بھی ہے

گرد کے لڈو پیڑے گندے بچے کھائیں
رانی بلّی ، دودھ جلیبی کھاتی ہے

اپنا ٹیپ بجا کر کوّا سنتا ہے
سب کو اپنی بولی اچھی لگتی ہے

عیب پرانے گھر کا یہ ہی ہے بابا
آئے نہ آئے کوئی ، گھنٹی بجتی ہے

اس سنسان سی شام میں اونچے ٹیلے پر
زُلفیں کھولے وہ لڑکی کیوں بیٹھی ہے

تین سمندر ، دو صحرا ، اس کے آگے
ناگن جیسی اِک لکیر چمکتی ہے

☼

(انتظار حسین کے نام جنھوں نے 'ادبِ لطیف' میں اس غزل کو دو صفحوں پر چھاپا تھا اور یوں ہمت بڑھائی تھی: اپنی حفاظت کرو تو اس عہد میں منفرد شاعر ہو۔)

یاد اب خود کو آ رہے ہیں ہم
کچھ دنوں تک خدا رہے ہیں ہم

آرزوؤں کے سُرخ پھولوں سے
دل کی بستی سجا رہے ہیں ہم

آج تو اپنی خامشی میں بھی
تیری آواز پا رہے ہیں ہم

بار کیا ہے کہ پھر زمانے کو
یاد رہ رہ کے آ رہے ہیں ہم

جو کبھی لوٹ کر نہیں آتے
وہ زمانے بلا رہے ہیں ہم

زندگی اب تو سادگی سے مل
بعد صدیوں کے آ رہے ہیں ہم

اب ہمیں دیکھ بھی نہ پاؤ گے
اتنے نزدیک آ رہے ہیں ہم

غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

ڈھوپ نکلی ہے مدتوں کے بعد
گیلے جذبے سکھا رہے ہیں ہم

فکر کی بے لباس شاخوں پر
فن کی پتّی لگا رہے ہیں ہم

سردیوں میں لحاف سے چمٹے
چاند تاروں پہ جا رہے ہیں ہم

زیست کی ایک برقی لڑکی کو
'نورنامہ' پڑھا رہے ہیں ہم

اس نے پوچھا ہمارے گھر کا پتہ
کافی ہاؤس بلا رہے ہیں ہم

کندھے اُچکا کے بات کرنے میں
منفرد ہوتے جا رہے ہیں ہم

چست کپڑوں میں جسم جاگ پڑے
روح و دل کو سُلا رہے ہیں ہم

کوئی شعلہ ہے کوئی جلتی آگ
جل رہے ہیں جلا رہے ہیں ہم

ٹیڈی تہذیب ، ٹیڈی فکر ونظر
ٹیڈی غزلیں سنا رہے ہیں ہم

(۱۹۶۰-۶۱ء)

☼

ہم سے مسافروں کا سفر، انتظار ہے
سب کھڑکیوں کے سامنے لمبی قطار ہے

چمکیلی سبز آنکھیں بہت دُور جا چکیں
کن گھنٹیوں کا راستوں کو انتظار ہے

بانسوں کے جنگلوں میں وہی تیز بُو ملی
جن کا ہماری بستیوں میں کاروبار ہے

آواز پھڑپھڑا کے وہیں دفن ہوگئی
سینے میں غالباً کوئی بجلی کا تار ہے

سورج بریدہ سر ہے زمیں کے شہید کا
یہ دُھوپ اس کے زرد بدن کی بہار ہے

غبّارہ پھٹ رہا ہے ہواؤں کے زور سے
دنیا کو اپنی موت کا اب انتظار ہے

جھانکا حقیر قطرے نے نیزے کی نوک سے
نیچے سیاہ رات کا بے انت غبار ہے

کس روشنی کے شہر سے گزرے ہیں تیز رَو
نیلے سمندروں پہ سنہرا غبار ہے

آئی ندا، وہ اُڑتے ستارے ادھر مڑے
ان بدلیوں کے پیچھے کوئی کوہسار ہے

☼

مرا کیا کہیں بھی چلا جاؤں گا
مگر راستہ تو بنا جاؤں گا

اگر بارشیں آ گئیں راہ میں
سمندر کی تہہ میں اُتر جاؤں گا

اگر مجھ کو کرنوں کے نیزے لگے
میں کتّے کو کچّا چبا جاؤں گا

اگر بوڑھے کمرے کی بتّی بجھی
میں خونخوار بلّی کو کھا جاؤں گا

اگر چاند، ہر سال آتے رہے
تو میں چاند ہی پر چلا جاؤں گا

یہاں دوسرا کوئی بستر نہیں
تو کیا میں تمھیں کوئی کھا جاؤں گا

☼

چمکتے چاند ستاروں کو اور کیا دو گے
ان آئنوں میں کئی بدلیاں چھپا دو گے

سمندروں پہ لہو نے کہانیاں لکھ دیں
تم ان کو برف کے اوراق میں دَبا دو گے

اُداسیوں میں مجھے رات بھر جلاؤ گے
مسرتوں میں سرِ شام ہی بجھا دو گے

میں رات روک لوں اتنی مری بساط نہیں
سنہری پٹریاں رستوں پہ تم بچھا دو گے

برس پڑیں گے بھرے بادلوں کے طیارے
کوئی ستارہ اگر پھول میں چھپا دو گے

تمام رات یہ اسٹیشنوں پہ بھٹکیں گے
ہرے درختوں سے پنچھی اگر اُڑا دو گے

کسے خبر تھی درختوں پہ سایہ کرنے کو
گلوں کی رنگ بھری چھتریاں لگا دو گے

گلابی جھیل میں نیلے ستارے تیریں گے
اگر بدن کی سبھی بتّیاں بجھا دو گے

تمھاری بستیاں پانی میں ڈوب جائیں گی
سمندروں کی اگر تشنگی بڑھا دو گے

☼

اس زخمی پیاسے کو اس طرح پلا دینا
پانی سے بھرا شیشہ پتھر پہ گرا دینا

ان پتّوں نے گرمی بھر سائے میں ہمیں رکھا
اب ٹوٹ کے گرتے ہیں بہتر ہے جلا دینا

چھوٹے قد و قامت پہ ممکن ہے ہنسے جنگل
اِک پیڑ بہت لمبا ہے اس کو گرا دینا

ممکن ہے کہ اس طرح وحشت میں کمی آئے
خوابیدہ درختوں میں تم آگ لگا دینا

اب دوسروں کی خوشیاں چبھنے لگیں آنکھوں میں
یہ بلب بہت روشن ہے اس کو بجھا دینا

باریک کفن پہنے تم چھت پر چلی جاؤ
جب بھیڑ سی لگ جائے یہ پردہ اٹھا دینا

وہ جیسے ہی داخل ہو سینے سے مرے لگ کر
تم کوٹ کے کالر پر ایک پھول لگا دینا

اس بدمزہ چائے میں سب ذائقے پائیں گے
اِک سونے کے چمچے کو ہر کپ میں چلا دینا

ہمارا درد ہماری دُکھی نوا سے لڑے
سلگتی آگ کبھی سرپھری ہوا سے لڑے

میں جانتا ہوں کہ انجام کار کیا ہوگا
اکیلا پتہ اگر رات بھر ہوا سے لڑے

سمجھنا بادلوں میں گھر گیا ہے میرا جہاز
لہو میں تر کوئی طائر اگر ہوا سے لڑے

مرے عزیز مجھے قتل کر کے پھینک آتے
بھلا ہوا کہ مرے لب مری صدا سے لڑے

سنہری مچھلیاں بادل میں کوند جاتی ہیں
بدن وہی ہے جو بندش میں بھی قبا سے لڑے

سیاہ برف میں ٹھٹھری ہے کائنات مری
کوئی ستارہ اُٹھے ٹوٹ کے خلا سے لڑے

تمام رات کی خونریز جنگ کا حاصل
بہت اندھیرا تھا اپنے ہی دست و پا سے لڑے

تمہارے شہر میں کیا ہو گیا تھا جس کے لیے
بشیر روتے رہے رات بھر خدا سے لڑے

☼

صوفے ، مسہری ، کنگھی ، بھورا لحاف ہے
لیکن ہر ایک شے پہ سنہرا غلاف ہے

سینے سے لگ کے کاٹتا رہتا ہے رات دن
دریا کا نرم مٹّی سے کیا اختلاف ہے

دُشمن ، نہ کوئی فوج ، نہ گھوڑے نہ شہسوار
خود سے لڑیں کہ آج تو میدان صاف ہے

ساحل کی تشنہ ریت پہ جو مہرباں ہوئی
دریا بھی ایسی موج کے بے حد خلاف ہے

ایسے ملو کہ اپنا سمجھتا رہے سدا
جس شخص سے تمھارا دلی اختلاف ہے

اپنے پہاڑ ، غیر کے گل زار ہو گئے
یہ بھی ہماری راہ کی دیوار ہو گئے

پھل پک چکا ہے شاخ پہ گرمی کی دھوپ میں
ہم اپنے دل کی آگ میں تیار ہو گئے

ہم پہلے نرم پتوں کی اِک شاخ تھے مگر
کاٹے گئے ہیں اتنے کہ تلوار ہو گئے

بازار میں بکی ہوئی چیزوں کی مانگ ہے
ہم اس لیے خود اپنے خریدار ہو گئے

تازہ لہو بھرا تھا سنہرے گلاب میں
انکار کرنے والے گنہگار ہو گئے

وہ سرکشوں کے پاؤں کی زنجیر تھے کبھی
اب بز دِلوں کے ہاتھ میں تلوار ہو گئے

پروں میں نور ہے، پرواز میں حرارت ہے
لہو ہوا میں کسی صبح کی شہادت ہے

کسی کا پیار مجھے دیر تک نہ روک سکا
مرے بدن پہ ہوا کی کوئی علامت ہے

فضا میں دھنکی ہوئی روئی کے جزیرے ملے
کہاں کہاں مرے احساس کی لطافت ہے

سفید برف کے خرگوش گدگدانے لگے
لطیف سردیوں میں نرم نرم جدّت ہے

رگوں میں سیکڑوں برفیلی سوئیاں اُتریں
مگر لہو میں ابھی تک وہی تمازت ہے

میں اپنے ہاتھ میں اپنا بریدہ سر لے کر
بہ غور دیکھوں مری واقعی جو صورت ہے

سیاہ سانپ کے سر پر سفید پھول کھلا
روایتوں میں بڑی پیچ دار جدّت ہے

صدا کی دھوپ نہ چمکے تو گھر اُجڑ جائے
وشال مندروں میں گھنٹیوں سے عظمت ہے

آنکھوں میں مسکراتی ہوئی نرم دُھوپ ہے
کس طرح سرد برف کے پتھر پگھل گئے

ہم کو دُعائیں دیتے تھے باہم یوں ہی ملو
شاخوں پر اُجلے اُجلے فرشتے کھلے ہوئے

میں گھر سے جب چلا تو کواڑوں کی اوٹ میں
نرگس کے پھول چاند کی بانہوں میں چھپ گئے

اس کی طرف چلا تھا کہ رستے میں بار بار
شیشے کی ٹوٹی گڑیوں کے ٹکڑے پڑے ملے

سب سو رہے ہیں ، چاند بہت پاس آ گیا
ڈرتا ہوں کوئی چھت پہ کھڑا ہو کے چھو نہ لے

جنگل میں ایک پیڑ سے آئی صدا ، رُکو
ہم لوگ جا رہے تھے یونہی ، گھومتے ہوئے

☼

کئی درختوں نے ایسا زمیں کو چھوڑ دیا
کہ جیسے واقعی ان کو لیے پھرے گی ہوا

کبھی جو دوسری جھیلوں کی سمت پیاس بڑھی
ہمارے سینے میں کوئی پرندہ چیخ پڑا

پھر اس کے بعد ابھی تک مجھے زمیں نہ ملی
ذراسی عمر تھی جب تنہا پہلی بار اُڑا

بدن دِکھائی نہ دے کیسی خوش لباسی ہے
یہ کیا دیا کہ غریبی کا بانکپن بھی گیا

مشینیں چل رہی ہیں کوٹ پینٹ پہنے ہوئے
کسی کا نام محبت، کسی کا نام وفا

☼

ہم کو بھی اپنی موت کا پورا یقین ہے
پر دُشمنوں کے ملک میں اِک مہ جبین ہے

سر پر کھڑے ہیں، چاند ستارے بہت مگر
انسان کا جو بوجھ اُٹھالے زمین ہے

یہ آخری چراغ اُسی کو بجھانے دو
اس بستی میں وہ سب سے زیادہ حسین ہے

تکیے کے نیچے رکھتا ہے تصویر کی کتاب
تحریری و گفتگو میں جو اتنا متین ہے

اشکوں کی طرح تھم گئیں جذبوں کی ناگنیں
بیدار میرے ہونٹوں پہ لفظوں کی بین ہے

یاروں نے جس پہ اپنی دُکانیں سجائی ہیں
خوشبو بتا رہی ہے ہماری زمین ہے

تفصیل کیا بتائیں ہمارے بھی عہد میں
تعداد شاعروں کی وہی 'پونے تین' ہے

☼

گزارے ہم نے کئی سال ایسے دفتر میں
کنواری لڑکی رہے جیسے غیر کے گھر میں

خدا کا شکر ابھی تک ہے اپنے جسموں میں
وہ ایک فرق جو ہوتا ہے مادہ و نَر میں

بہت سنبھال کے رکھا تھا نیک بیوی نے
ہوا چلی تو برادہ بکھر گیا گھر میں

مری نگاہ کسی دوسرے کو تکنے لگی
وہ لڑکی بیٹھ گئی جب مرے برابر میں

اسے پکارا تو آنگن کی مہندی بول پڑی
پکارتے ہو انھیں رات کو کہاں گھر میں

یہ آسمان زمیں کا بدن چبائے گا
ستارے ٹوٹ کے گر جائیں گے سمندر میں

☼

سانپ ، جب اوس کا بدن چاٹے
ریت کو ریت کی جلن چاٹے

برف کی انگلیاں اگر چوموں
میرے تلووں کو اِک کرن چاٹے

کس محبت سے چومتے ہو ہمیں
سانپ جس طرح اپنا من چاٹے

ایک لمحے کی روشنی کے لیے
آگ کاغذ کے پیرہن چاٹے

ایک ہزار ایک ، رات کے پھَن ہیں
جب یہ ناگن کسی کا تن چاٹے

مرد اس سمت دیکھتے ہی نہیں
گائے جب گائے کا بدن چاٹے

زرد کتّے کی سُرخ جیبھ کبھی
سرمئی رات کی تھکن چاٹے

ایک بلّی سفید چوہے کا
دُھوپ میں بیٹھ کر بدن چاٹے

ایک خرگوش برف پر لیٹا
اِک گلہری کا سرد تن چاٹے

آئینہ خانے میں اکیلا سانپ
جھوم جھوم آج اپنا پھَن چاٹے

دو منٹ میں کوکر کی سات ڈشیں
اُنگلیاں ، اب غزل کا فن چاٹے

☼

جب سحر چپ ہو ، ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو

ہم حقیقت ہیں نظر آتے ہیں
داستانوں میں چھپا لو ہم کو

دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز
صبح سے پہلے اُٹھا لو ہم کو

ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت
اپنے سینے سے لگا لو ہم کو

وقت کے ہونٹ ہمیں چھو لیں گے
اَن کہے بول ہیں گا لو ہم کو

(۱۹۵۸ء)

☼

پھول سا کچھ کلام اور سہی
اِک غزل اس کے نام اور سہی

اس کی زُلفیں بہت گھنیری ہیں
ایک شب کا قیام اور سہی

زندگی کے اُداس قصّے ہیں
ایک لڑکی کا نام اور سہی

کرسیوں کو سنایئے غزلیں
قتل کی ایک شام اور سہی

کپکپاتی ہے رات سینے میں
زہر کا ایک جام اور سہی

آیا ہی نہیں ہم کو آہستہ گزر جانا
شیشے کا مقدر ہے ٹکرا کے بکھر جانا

تاروں کی طرح شب کے سینے میں اُتر جانا
آہٹ نہ ہو قدموں کی اس طرح گزر جانا

نشے میں سنبھلنے کا فن یوں ہی نہیں آتا
ان زلفوں سے سیکھا ہے لہرا کے سنور جانا

بھر جائیں گے آنکھوں میں آنچل سے بندھے بادل
یاد آئے گا جب گل پر شبنم کا بکھر جانا

ہر موڑ پر دو آنکھیں ہم سے یہی کہتی ہیں
جس طرح بھی ممکن ہو تم لوٹ کے گھر جانا

پتھر کو مرا سایہ آئینہ سا چمکا دے
جاناں تو مرا شیشہ یوں درد سے بھر جانا

یہ چاند ستارے تم اوروں کے لیے رکھ لو
ہم کو یہیں جینا ہے ہم کو یہیں مر جانا

جب ٹوٹ گیا رشتہ سرسبز پہاڑوں سے
پھر تیز ہوا جانے ہم کو ہے کدھر جانا

☼

ہر روز ہمیں ملنا ہر روز بچھڑنا ہے
میں رات کی پرچھائیں تو صبح کا چہرا ہے

عالم کا یہ سب نقشہ بچوں کا گھروندا ہے
اِک ذرّے کے قبضے میں سہمی ہوئی دُنیا ہے

ہمراہ چلو میرے یا راہ سے ہٹ جاؤ
دیوار کے روکے سے دریا کہیں رُکتا ہے

ان کے ہی اشاروں پر یہ رات ملی ہم کو
جن چاند سے چہروں کا سایہ بھی سنہرا ہے

سنّاٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموش بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

اِک گونج بھٹکتی ہے سنسان پہاڑوں میں
جب رات کے سینے میں دل میرا دھڑکتا ہے

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں
خاموش درختوں پہ سہما ہوا نغمہ ہے

پلکوں کے مہ و انجم مٹّی میں ملاتے ہو
شبنم کی پھواروں سے پتھر کہیں پگھلا ہے

☼

جو ادھر سے جا رہا ہے وہی مجھ پر مہرباں ہے
کبھی آگ پاسباں ہے، کبھی دھوپ سائباں ہے

بڑی آرزو تھی مجھ سے کوئی خاک رو کے کہتی
اتر آ میری زمیں پر تو ہی میرا آسماں ہے

میں اسی گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر ، مرا پیار جاوداں ہے

کبھی سرخ مومی شمعیں وہاں پھر سے جل سکیں گی
وہ لکھوری اینٹوں والا جو بڑا سا اِک مکاں ہے

سبھی برف کے مکانوں پہ کفن بچھے ہیں لیکن
یہ دھواں بتا رہا ہے ابھی آگ بھی یہاں ہے

کوئی آگ جیسے کہرے میں دَبی دَبی سے چمکے
تری جھلملاتی آنکھوں میں عجیب سا سماں ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

☼

سائے اُترے، پنچھی لوٹے، بادل بھی چھانے والا ہے
لیکن میں وہ ٹوٹا تارا جو گھر سے جانے والا ہے

پھر صبح ہوئی آنکھیں کھولیں، کپڑے بدلیں فیتے باندھیں
اس شہر کے بارے میں سوچیں جو شہر اب آنے والا ہے

کل شب اِک ویراں مسجد میں اس نے میرے آنسو پونچھے
جو ہم سب کی سوکھی شاخوں پر پھول کھلانے والا ہے

دل کے یہ دونوں دروازے کبھی نہیں بے نور ہوئے ہیں
صدیوں سے اس اُجڑے گھر میں اِک دیا جلانے والا ہے

میں وہ شبنم جو پھولوں کی آنکھوں میں رہے اور یہ سوچے
ایسا لگتا ہے جیسے اب سب ہاتھ سے جانے والا ہے

ہم ریت کے جلتے ذرّوں کو یہ دُھوپ ہی چمکائے ورنہ
دریا کترانے والا ہے، بادل ترسانے والا ہے

جگنو چمکے تو میں چونکوں، تارا نکلے تو میں سہموں
جیسے ہر کوئی میرے ہی گھر آگ لگانے والا ہے

جس چھپر کے نیچے گاؤں کے بوڑھے حقّہ پیتے ہیں
اس چھت میں اِک پاگل لڑکا اب آگ لگانے والا ہے

جس آئینے کو برس میں تم رکھے پھرتے تھے ٹوٹ گیا
یہ دُھوپ کا شیشہ آنکھوں پر نیزے چمکانے والا ہے

☼

رات کے سمندر میں ڈوب گئی شام
میرے بھی سینے میں آئے مری شام

بادل تھے کمرے میں بکھرے پڑے
بستر پر لیٹی تھی تھکی ہوئی شام

بند کیے بیٹھے تھے یادوں کا گھر ہم
دروازہ کھول کر چلی گئی شام

سارے بدن کا تناؤ فضا میں
گسے گسے کپڑوں میں پھنسی شام

تاروں کی آنکھوں میں کرنوں کے نیزے
سورج کے سینے میں چبھی ہوئی ہے

تھکے تھکے پیڈل کے بیچ چلے سورج
گھر کی طرف لوٹی دفتر کی شام

☼

کہرے کے کمبل میں پول کپکپائے
دو بلب چشمے کے پیچھے تھرتھرائے

ہیٹر میں بجھی بجھی بیمار سوں سوں
پانی تو پانی ہے کیسے کھول جائے

چہرے پر کیلے کے چھلکے بھی ماریں
بلّے سے پہلے اگر گیند گھوم جائے

ساحل پہ مچھلی نے کپڑے اُتارے
چڑھے ہوئے دریا کی دھار کہے ہائے

ہر سمت موٹر کی آنکھوں کے نیزے
جیسے مشینوں بیچ ہاتھ آ جائے

ہوا چلی لہروں سے لہریں لپٹ جائیں
موجوں کی چال پر کگار کٹ جائیں

بجلی کے دہکے ہوئے تاروں کو چھولیں
کہو ریل گاڑی کے نیچے کٹ جائیں

چھوٹے سے ڈبّے میں اتنے مسافر
مل جل کے سب بیٹھیں آؤ سٹ جائیں

کتنے ہی تنہا کپاسی رنگ دھاگے
ریشم کی ڈوری کے ساتھ بٹ جائیں

اُونچا اُڑاکر ہم کو لڑا دو
چاہے اُسے کاٹیں اور چاہے کٹ جائیں

کاہے کو بھاگو ہو سورج کے پیچھے
راتیں بھی ایسی جو لپٹ لپٹ جائیں

چکنے لحافوں میں ڈوب گئے تارے
ہم بھی پھٹی چادر کے ساتھ لپٹ جائیں

ٹھنڈی ہواؤں میں کیسی لپک ہے
پھولوں کے رنگ بھرے ہونٹ پھٹ جائیں

☼

مجھے بھلائے کبھی یاد کر کے روئے بھی
وہ اپنے آپ کو بکھرائے اور پروئے بھی

شمار ہم نہ ہوئے اُن چمکنے والوں میں
بدن بھی ملتے رہے، روز کپڑے دھوئے بھی

بہت غبار بھرا تھا دِلوں میں دونوں کے
مگر وہ ایک ہی بستر پہ رات سوئے بھی

بہت دِنوں سے نہائے نہیں ہیں آنگن میں
کبھی تو راہ کی بارش ہمیں بھگوئے بھی

یہ تم سے کس نے کہا رات سے میں ڈرتا ہوں
ضرور آئے میرے بازوؤں میں سُوئے بھی

وہ نوجوان جوانی کی نیند میں گم تھا
بہت پکارا، جھنجھوڑا، لپٹ کے روئے بھی

یقین جانیے احساس تک نہ ہوگا ہمیں
نسوں میں سوئیاں کوئی اگر چبھوئے بھی

☼

شبنم ہوں، سُرخ پھولوں پہ بکھرا ہوا ہوں میں
دل موم اور دُھوپ میں بیٹھا ہوا ہوں میں

کچھ دیر بعد راکھ ملے گی تمھیں یہاں
لَو بن کے اس چراغ سے لپٹا ہوا ہوں میں

دنیا ہے بے پناہ تو بھرپور زندگی
دو عورتوں کے بیچ میں لیٹا ہوا ہوں میں

جو ایک شیر خوار کے لب تر نہ کر سکے
ایسے سپاٹ سینے سے چمٹا ہوا ہوں میں

دو سخت خشک روٹیاں کب سے لیے ہوئے
پانی کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں میں

لادی اُٹھا کے گھاٹ پہ جانے لگے ہرن
کیسے عجیب دَور میں پیدا ہوا ہوں میں

خود میرا ہاتھ بھی نہ پہنچ پائے گا کبھی
اتنے بلند طاق پہ رکھا ہوا ہوں میں

اس کو ہی لوگ چوم کے فنکار ہو گئے
جس ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا ہوں میں

بہتر ہوں لوٹ جاؤں میں اپنی زمین پر
کس آس پر خلاؤں میں لٹکا ہوا ہوں میں

نَس نَس میں پھیل جاؤں گا بیمار رات کی
پلکوں پہ آج شام سے سمٹا ہوا ہوں میں

اوراق میں چھپاتی تھی اکثر وہ تتلیاں
شاید کسی کتاب میں رکھا ہوا ہوں میں

سبزے میں انکسار و قناعت تلاش کر
گل ہوں، اگرچہ شاخ سے ٹوٹا ہوا ہوں میں

دریاؤں اور نہروں کی سینچی ہوئی ہے وہ
چھت چھت ہزار بار کا برسا ہوا ہوں میں

گنبد ہوں اپنے عہد کی سنسان رات کا
تنہائیوں کی گونج سے گونجا ہوا ہوں میں

☼

کوئی جاتا ہے یہاں سے نہ کوئی آتا ہے
یہ دِیا اپنے اندھیرے میں گھٹا جاتا ہے

سب سمجھتے ہیں وہی رات کی قسمت ہوگا
جو ستارہ کہ بلندی پہ نظر آتا ہے

بلڈنگیں لوگ نہیں ہیں جو کہیں بھاگ سکیں
روز انسانوں کا سیلاب بڑھا جاتا ہے

میں اسی کھوج میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں
کس کا آنچل ہے جو کہساروں پہ لہراتا ہے

میری آنکھوں میں ہے اِک ابر کا ٹکڑا شاید
کوئی موسم ہو سرِ شام برس جاتا ہے

دے تسلّی کوئی تو آنکھ چھلک اُٹھتی ہے
کوئی سمجھائے تو دل اور بھی بھر آتا ہے

اَبر کے کھیت میں بجلی کی چمکتی ہوئی راہ
جانے والوں کے لیے راستہ بن جاتا ہے

آخر کے تین شعر 1958ء کے ہیں جو 'سویرا' لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری تھی کہ جدید غزل میں 'اَبر کا ٹکڑا' بہت برسا۔

☼

راکھ اُڑتی ہے اب ہلالوں پر
دھوپ تھی سیب جیسے گالوں پر

آگ محفوظ رکھیۓ سینے میں
برف جمنے لگی ہے بالوں پر

پیس کر کس نے لیپ دی ہلدی
سبز موسم کے سُرخ گالوں پر

پیڑ تو کٹ چکا، کہاں ہوں گے
جو چہکتے بہت تھے ڈالون پر

ناف میں پھول، ران پر مچھلی
تتلیاں سو رہی ہیں گالوں پر

صرف اک خواب تھی جدید غزل
ناز کر ہم سے بے کمالوں پر

☼

ہر بے زبان گل میں چہکنے لگے ہیں ہم
دولت گئی تو اور مہکنے لگے ہیں ہم

غربت برا نشہ ہے اسی کا اثر نہ ہو
اب بات بات پر جو بہکنے لگے ہیں ہم

مٹی کی باس اپنے بدن کی اسیر تھی
یہ تیرا قرب ہے کہ مہکنے لگے ہیں ہم

دنیا سمجھ رہی تھی کہ اب راکھ ہو چکے
کیسی ہوا چلا دی، دہکنے لگے ہیں ہم

جن کی زبانیں کٹ گئیں پھولوں کے نام پر
ان بلبلوں کی طرح چہکنے لگے ہیں ہم

☼

گلوں کی طرح ہم نے زندگی کو اس قدر جانا
کسی کی زلف میں اک رات سونا اور بکھر جانا

اگر ایسے گئے، تو زندگی پر حرف آئے گا
ہواؤں سے لپٹنا، تتلیوں کو چوم کر جانا

دُھنک کے رکھ دیا تھا بادلوں کو جن پرندوں نے
انھیں کس نے سکھایا اپنے سائے سے بھی ڈر جانا

کہاں تک یہ دیا بیمار کمرے کی فضا بدلے
کبھی تم ایک مٹھی دھوپ ان طاقوں میں بھر جانا

اسی میں عافیت ہے گھر میں اپنے چین سے بیٹھو
کسی کی سمت جانا ہو تو رستے میں اتر جانا

☼

قدم جمانا ہے اور سب کے ساتھ چلنا ہے
ہم اپنی راہ کا پتھر ہیں اور دریا بھی

مگر جو فاصلہ پہلے تھا اور بڑھتا گیا
میں اس کے پاس گیا وہ اِدھر سے گزرا بھی

بہت ذہین و زمانہ شناس تھا لیکن
وہ رات بچوں کی صورت لپٹ کے رویا بھی

یہ خشک شاخ نہ سرسبز ہو سکی اس نے
مجھے گلے سے لگایا پلک سے چوما بھی

چراغ جلنے سے پہلے ہمیں پہنچنا ہے
ڈھکے ہوئے ہے پہاڑوں کو آج کہرا بھی

ہزاروں میل کا منظر ہے اس نگینے میں
ذرا سا آدمی دریا ہے اور صحرا بھی

وہی شرارہ کہ جس سے جھلس گئیں پلکیں
ستارہ بن کے مری رات میں وہ چمکا بھی

اثر وہی ہوا آخر اگرچہ پہلے پہل
ہوا کا ہاتھ گلوں کے بدن پہ پھسلا بھی

انھیں تو حفظ تھے سب اپنے لوگ نام بنام
ہمیں کو یاد نہ آیا کسی کا چہرہ بھی

ہم اپنا گھر بھی نہ اب ڈھونڈ پائیں گے شاید
اگر ہمارا ہوا اس طرف کو پھیرا بھی

ابھی زمانہ سے شاید ہو سو برس پیچھے
تمھارا دل بھی سلامت ہے اور چہرہ بھی

مگر جو فاصلہ پہلے تھا اور بڑھتا گیا
میں اس کے پاس گیا وہ ادھر سے گزرا بھی

☼

چاند کا ٹکڑا نہ سورج کا نمائندہ ہوں
میں نہ اس بات پہ نازاں ہوں نہ شرمندہ ہوں

دفن ہو جائے گا جو سینکڑوں من مٹّی میں
غالباً میں بھی اسی شہر کا باشندہ ہوں

زندگی تو مجھے پہچان نہ پائی لیکن
لوگ کہتے ہیں کہ میں تیرا نمائندہ ہوں

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے
کوئی کہتا ہے بچالو میں ابھی زندہ ہوں

تن پہ کپڑے ہیں قدامت کی علامت اور میں
سر برہنہ یہاں آجانے پر شرمندہ ہوں

واقعی اس طرح میں نے کبھی سوچا ہی نہیں
کون ہے اپنا یہاں کس کے لیے زندہ ہوں

☼

کسے خبر تھی تجھے اس طرح سجاؤں گا
زمانہ دیکھے گا اور میں نہ دیکھ پاؤں گا

حیات و موت فراق و وصال سب یکجا
میں ایک رات میں کتنے دیے جلاؤں گا

پلا بڑھا ہوں ابھی تک انھیں اندھیروں میں
میں تیز دھوپ سے کیسے نظر ملاؤں گا

مرے مزاج کی یہ مادرانہ فطرت ہے
سویرے ساری اذیت میں بھول جاؤں گا

تم ایک پیڑ سے وابستہ ہو مگر میں تو
ہوا کے ساتھ بہت دُور دُور جاؤں گا

مرا یہ عہد ہے میں آج شام ہونے تک
جہاں سے رزق لکھا ہے وہیں سے لاؤں گا

☼

کوئی نہ جان سکا وہ کہاں سے آیا تھا
اور اس نے دھوپ سے بادل کو کیوں ملایا تھا

یہ بات لوگوں کو شاید پسند آئی نہیں
مکان چھوٹا تھا لیکن بہت سجایا تھا

وہ اب وہاں ہے جہاں راستے نہیں جاتے
میں جس کے ساتھ یہاں پچھلے سال آیا تھا

سنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

چراغ ڈوب گئے کپکپاتے ہونٹوں پر
کسی کا ہاتھ ہمارے لبوں تک آیا تھا

بدن کو چھوڑ کے جانا ہے آسماں کی طرف
سمندروں نے ہمیں یہ سبق پڑھایا تھا

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا
وہ اک چراغ جو میں نے کبھی بجھایا تھا

☼

پانچ پیسے میں ایک قتل کرے
واقعی آج جس کو جینا
ہے

پھر مری ہڈیاں چچوڑے گا
آسماں کا جو زرد کتّا
ہے

یاد کے بلغمی ، بچھونے پر
گندگی کا وجود لیٹا
ہے

ناگ اس چاندنی کے زینے پر
میرے بستر پر روز آتا
ہے

چونچ پتھر کی ہل نہیں سکتی
گھاس میں ایک سرخ کیڑا
ہے

دن ڈھلا شام ہو گئی لیکن
سانپ دریا کے پاس بیٹھا
ہے

سرخ شاخوں کے بیچ بائیں طرف
شہد کی مکھیوں کا چھتّا
ہے

ہماری شہرتوں کی مَوت بے نام و نشاں ہو گی
نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ کوئی داستاں ہوگی

اگر میں لوٹنا شاہوں تو کیا میں لوٹ سکتا ہوں
وہ دنیا ساتھ جو میرے چلی تھی اب کہاں ہوگی

پرندے اپنی منقاروں میں سب تارے چھپالیں گے
جوانی چار دن کی چاندنی ہے پھر کہاں ہوگی

درختوں کی یہ چھالیں بھی اتر جائیں گی، پتّے گی
یہ دنیا دھیرے دھیرے ایک دن پھر سے جواں ہوگی

ہوائیں روئیں گی سر پھوڑلیں گی ان پہاڑوں سے
کبھی جب بادلوں میں چاند کی ڈولی رواں ہوگی

کسے معلوم تھا ہم لوگ اِک بستر پہ سوئیں گے
حفاظت کے لیے تلوار اپنے درمیاں ہوگی

پسینہ بند کمرے کی اُمس کا جذب ہے اس میں
ہمارے تولیے میں دھوپ کی خوشبو کہاں ہوگی

کسی گمنام پتھر پر بہت سے نام لکھ دوگے
تو قربانی ہماری اس طرح سے جاوداں ہوگی

زمینیں تو مرے اجداد نے سارے گنوا دی ہیں
مگر یہ ایک مٹھی خاک خود اپنا نشاں ہوگی

سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور ایک فاحشہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہوگی

☼

جب رات کو تنہائی سینے میں دھڑکتی ہے
یادوں کے دریچے میں چلمن سی سرکتی ہے

یہ چاندنی بھی جن کو چھوتے ہوئے ڈرتی ہے
دنیا انہی پھولوں کو پیروں سے مسلتی ہے

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشہ ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

لوبان میں چنگاری جیسے کوئی رکھ جائے
یوں یاد تری شب بھر سینے میں سلگتی ہے

آنسو کبھی پلکوں پر تا دیر نہیں رُکتے
اُڑ جاتے ہیں یہ پنچھی جب شاخ لچکتی ہے

خوش رنگ پرندوں کے لوٹ آنے کے دن آئے
بچھڑے ہوئے ملتے ہیں جب برف پگھلتی ہے

☼

پھول برسے کہیں شبنم کہیں گوہر برسے
اور اس دل کی طرف برسے تو پتھر برسے

بارشیں، چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جوان کمروں کے اندر برسے

(1959ء)

ہم سے مجبور کا غصّہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اُٹھے اپنے ہی دل پر برسے

اب بھی محفوظ ہیں مٹّی میں دفینے کتنے
رات پتھرائی ہوئی آنکھوں سے گوہر برسے

کون کہتا ہے کہ رنگوں کے فرشتے اُتریں
جو بھی برسے مگر اس بار تو گھر گھر برسے

(1973ء)

سینے میں آگ ، آگ میں آہن بھی چاہیے
رِم جھم برستا باتوں سے ساون بھی چاہیے

تلوار توڑنے سے تلافی کہاں ہوئی
ان بزدِلوں کے ہاتھ میں کنگن بھی چاہیے

سینے میں آفتاب سا اِک دل ضرور ہو
ہر گھر میں ایک دُھوپ کا آنگن بھی چاہیے

سورج خود اپنی آگ سے سورج ہے آج تک
انسان کے مزاج میں اُلجھن بھی چاہیے

اس فاحشہ زمیں کے لیے آسماں بنو
دنیا سمیٹ لینے کو دامن بھی چاہیے

کوئی فقیر ہوں جو کٹورہ لیے پھروں
کھانے کے ساتھ کھانے کے برتن بھی چاہیے

یوں زندگی کے سینے سے آنچل نہ کھینچیے
سچائیوں میں جھوٹ کا کچھ فن بھی چاہیے

بچوں کے ساتھ جھاڑیوں میں جگنو ڈھونڈیے
دل کے معاملات میں بچپن بھی چاہیے

ہم آدمی ہیں یا کوئی بے حس چٹان ہیں
دل میں کسی کے نام کی دھڑکن بھی چاہیے

راہیں روایتوں کی اگر روندنے چلوں
سر پر مجھے بزرگوں کا دامن بھی چاہیے

☼

ان آنکھوں سے دن رات برسات ہوگی
اگر زندگی صرف جذبات ہوگی

مسافر ہو تم بھی، مسافر ہیں ہم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

صداؤں کو الفاظ ملنے نہ پائیں
نہ بادل گھریں گے نہ برسات ہوگی

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا
بڑی دُور تک رات ہی رات ہوگی

ازل سے ابد تک سفر ہی سفر ہے
کہیں صبح ہوگی کہیں رات ہوگی

☼

اب ہوئی داستاں رقم بابا
انگلیاں ہوگئیں قلم بابا

کاغذی جوئے شیر لاتے ہیں
اپنا تیشہ یہی قلم بابا

چاند اکثر اُداس رہتا ہے
اس کو آخر ہے کس کا غم بابا

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا

اب تو تنہائیاں بھی کہتی ہیں
ہے ترا بھی کوئی صنم بابا

عشق نے یہ بھی رتبہ ہم کو دِیا
لوگ کہتے ہیں محترم بابا

متفرق اشعار

برف سی اُجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہوں
دادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنالے گا، بہتا ہوا پانی ہے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

(1958ء)

سجھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے
کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

(1969ء)

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنھیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

دو بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے ملیں، یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر، اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

اِک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر رات کے راستوں کی طرح کھو گیا
نرم مٹّی پہ گرتی ہوئی پتّیاں ، سونے والے کو چادر اڑھاتی رہیں

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر
عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا

یوں کسی کی آنکھوں میں صبح تک ابھی تھے ہم
جس طرح رہے شبنم پھولوں کے پیالوں میں

میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

اِک معصوم سے پیار کا تحفہ گھر کے آنگن میں پایا تھا
اس کو غم کے پاگل پن میں کوٹھے کوٹھے بانٹ دیا

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

پھول دوا جیسے مہکے ہیں
کس بیمار کی صبح ہوئی ہے

جہاں پہ ملتی تھیں دو کرنیں اس شجر کے تلے
دلائی اوڑھے ہوئے اِک فقیر بیٹھا ہے

سنّاٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

اِک لڑکی، ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اُجلی دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

جیسے کہ سارے شہر کی بجلی چلی گئی
آنکھیں کھلی تھیں مگر سوجھتا نہ تھا

اب* ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

آنکھیں آنسو دل بھی آنسو شاید ہم سرتاپا آنسو
تھوڑی مٹّی اور ملا دے ابھی بہت گیلی ہے مٹّی

بارہا یہ ہمیں محسوس ہوا
درد سینے کا خدا ہو جیسے

پھول کی آنکھ میں شبنم کیوں ہے
سب ہماری ہی خطا ہو جیسے

---

* پروفیسر عالی مقام خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام جنھوں نے ایک انٹرویو میں اس کی ایسی تشریح کی کہ کئی یونیورسٹیوں مثلاً رانچی یونیورسٹی، ایم اے اُردو میں پوچھا گیا کہ کیا اُردو غزل کے سارے سرمائے سے یہ شعر بالکل الگ اور نیا ہے؟

میری آنکھوں میں اِک چاندنی چوک ہے
گزری عمرِ رواں چاندنی چوک میں

میری آنکھ کے تارے اب نہ دیکھ پاؤ گے
رات کے مسافر تھے کھو گئے اُجالوں میں

جانے کس دیس سے دل میں آ جاتے ہیں
چاندنی رات میں درد کے کارواں

بارشیں، چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

دل کی بستی پرانی دلّی ہے
جو بھی گزرا ہے اس نے لوٹا ہے

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
انھیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا کتنا سرد ہے

اِک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

کسی مصلحت سے بہار خود مرے لب کے پاس ٹھہر گئی
مری آرزو تھی خزاں کے خشک و اُداس ہونٹوں کو چوم لوں

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

اس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اس نے مجھ سے نفرت کی ہے

بہت دِنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

سب کھلے ہیں کسی کے عارض پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہَرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

خوبصورت ، ادا ، خوفزدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

ہنس پڑی شام کی اُداس فضا
اس طرح چائے کی پیالی ہنسی

یہ زعفرانی پلوور اسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رُک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارے جیسا ہے

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں
ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے

میرے لبوں پہ چاند کی قاشیں لرز گئیں
آنکھوں پہ کالی رات کے گیسو بکھر گئے

میرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے
چھو سکے گی انھیں شراب کہاں

تیرے اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر
دُھوپ کتنی ہی مہربان ہو جائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

رات اِک خواب ہم نے دیکھا ہے
پھول کی پنکھڑی کو چوما ہے

دو جھیلیں اس کی آنکھوں میں لہرا کے سو گئیں
اس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا

دو کالے ہونٹ جام سمجھ کر چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو کیا نہ تھا

رات تیری یادوں نے دل کو اس طرح چھیڑا
جیسے کوئی چٹکی لے نرم نرم گالوں میں

آنکھیں انسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں، نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آگئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

جیسے کشمیری جھیلوں کی آغوش میں ننھے ننھے ستارے اُتر آئے ہوں
رات ان نیلی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی آنسوؤں کے دیے جھلملاتے رہے

یہ بات کہ صورت کے بھلے دل کے بُرے ہو
اللہ کرے جھوٹ ہو بہتوں سے سُنی ہے

ہم دلّی بھی ہو آئے ہیں لاہور بھی گھومے
اے یار مگر تیری گلی تیری گلی ہے

زندگی تری فکریں، کھلتے ہی گلابوں کا، رس نچوڑ لیتی ہے
پھول جیسی عمروں کے، سوچتے ہوئے بچّے، بوڑھے ہوتے جاتے ہیں

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے
مسافر کو گلی پہچانتی ہے

وقت سو منصفوں کا منصف ہے
وقت آئے گا انتظار کرو

جب بھی بادلوں میں گھرتا ہے
چاند لگتا ہے آدمی کی طرح

آج کمرے میں نہیں بیٹھنے والا موسم
برف گرنے کی خبر گرم ہے گھر سے نکلو

میں دن ہوں میری جبیں پر دُکھوں کا سورج ہے
دیے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

شیشے کا تاج سر پہ رکھے آ رہی تھی رات
ٹکرائی ہم سے چاند ستارے بکھر گئے

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

آج میں جاگوں گا کہ سوتے میں
میری پلکوں کو چومتا ہے کوئی

میرا شیطان مر گیا شاید
میرے سینے پہ سو رہا ہے کوئی

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا
کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

سارے دن کی تپی ساحلی ریت پر دو تڑپتی ہوئی مچھلیاں سو گئیں
اپنے ملنے کی وہ آخری شام تھی لہریں آتی رہیں، لہریں جاتی رہیں

OO

آمد

☼

میں نے تری آنکھوں میں پڑھا اللہ ہی اللہ
سب بھول گیا یاد رہا اللہ ہی اللہ

پھولوں میں بسی چاندنی راتوں کی نمازیں
خوشبو سی ستاروں کی دُعا اللہ ہی اللہ

پیڑوں کے صفیں پاک فرشتوں کی قطاریں
خاموش پہاڑوں کی ندا اللہ ہی اللہ

بادل کی عبادت ہے برستا ہوا پانی
آنسو کی غزل حمد و ثنا اللہ ہی اللہ

اِک پھول نے کونین کی دولت مجھے دے دی
آنسو سے ہتھیلی پہ لکھا اللہ ہی اللہ

ہم دونوں اسی پاک سمندر کی ہیں لہریں
لا ہاتھ میرے ہاتھ میں لا اللہ ہی اللہ

اِک نام کی تختی کا مجھے شوق ہوا تھا
پانی پہ ہواؤں نے لکھا اللہ ہی اللہ

وہ سورۂ یٰسین کہ کافور کی خوشبو
مہکے ہوئے پھولوں کی رِدا اللہ ہی اللہ

☼

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر میں رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا
تمھیں جس نے دل سے بھلا دیا اسے بھولنے کی دُعا کرو

مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو، جو سنا نہیں وہ کہا کرو

کبھی حسنِ پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں مرے ساتھ تم بھی چلا کرو

نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا کوئی اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمیِ شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا نہ کرو

یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اُداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمھارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

☼

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

وہی خط کہ جس پہ جگہ جگہ دو مہکتے ہونٹوں کے چاند تھے
کسی بھولے بسرے سے طاق پر تہِ گرد ہوگا دبا ہوا

مجھے حادثوں نے سجا سجا کر بہت حسین بنا دیا
مرا دل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رَچا ہوا

وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان بھی
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

مرے ساتھ جگنو ہے ہم سفر، مگر اس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

☼

آنکھوں میں رہا دل میں اُتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اِک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

☼

چمک رہی ہے پروں میں اُڑان کی خوشبو
بلا رہی ہے بہت آسمان کی خوشبو

بھٹک رہی ہے پرانی دُلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو

دَبا تھا پھول کوئی میز پوش کے نیچے
گرج رہی تھی بہت پیچوان کی خوشبو

عجب وقار تھا سُوکھے سنہرے بالوں میں
اُداسیوں کی چمک زرد لان کی خوشبو

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رَچی بسی ہوئی اُردو زبان کی خوشبو

غزل کی شاخ پہ اِک پھول کھلنے والا ہے
بدن سے آنے لگی زعفران کی خوشبو

عمارتوں کی بلندی پہ کوئی موسم کیا
کہاں سے آئے گی کچے مکان کی خوشبو

گلوں پہ لکھتی ہوئی لاالٰہ الا اللہ
پہاڑیوں سے اُترتی اذان کی خوشبو

☼

ہنسی، معصوم سی بچوں کی کاپی میں عبارت سی
ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی

وہ جیسے سردیوں میں گرم کپڑے دے فقیروں کو
لبوں پہ مسکراہٹ تھی مگر کیسی حقارت سی

اُداسی پت جھڑوں کی شام اوڑھے راستہ تکتی
پہاڑی پر ہزاروں سال کی کوئی عمارت سی

سجائے بازوؤں پر باز وہ میداں میں تنہا تھا
چمکتی تھی یہ بستی دُھوپ میں تاراج و غارت سی

میری آنکھوں، میرے ہونٹوں پہ یہ کیسی تمازت ہے
کبوتر کے پروں کی ریشمی اُجلی حرارت سی

کھلا دے پھول میرے باغ میں پیغمبروں جیسا
رقم ہو جس کی پیشانی پہ اِک آیت بشارت سی

☼

ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا کھل گئے بادباں لوٹ جا لوٹ جا
سانولی سرزمیں پر میں اگلے برس پھول کھلنے سے پہلے ہی آ جاؤں گا

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اُتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

میرے بچپن کے مندر کی وہ مورتی دُھوپ کے آسماں پہ کھڑی تھی مگر
ایک دن جب مراقد مکمل ہوا اس کا سارا بدن برف میں دھنس گیا

اَن گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے
فاختہ دُھوپ کے پُل پہ بیٹھی رہی رات کا ہاتھ چپ چاپ بڑھتا گیا

☼

سنوار نوک پلک ابروؤں میں خم کردے
گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کردے

غرور اس پہ بہت سجتا ہے مگر کہہ دو
اسی میں اس کا بھلا ہے غرور کم کردے

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کردے

چمکنے والی ہے تحریر میری قسمت کی
کوئی چراغ کی لَو کو ذرا سا کم کردے

کسی نے چوم کے آنکھوں کو یہ دُعا دی تھی
زمین تیری خدا موتیوں سے نم کردے

☼

کوئی لشکر ہے کہ بڑھتے ہوئے غم آتے ہیں
شام کے سائے بہت تیز قدم آتے ہیں

دل وہ درویش ہے جو آنکھ اُٹھاتا ہی نہیں
اس کے دروازے پہ سو اہلِ کرم آتے ہیں

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ اب میرے لیے
کبھی سونے کبھی چاندی کے قلم آتے ہیں

میں نے دو چار کتابیں تو پڑھی ہیں لیکن
شہر کے طور طریقے مجھے کم آتے ہیں

خوب صورت سا کوئی حادثہ آنکھوں میں لیے
گھر کی دہلیز پہ ڈرتے ہوئے ہم آتے ہیں

☼

وہ درودوں کے، سلاموں کے نگر یاد آئے
نعتیں پڑھتے ہوئے قصبات کے گھر یاد آئے

گھر کی مسجد میں وہ نورانی اذاں سے چہرے
ان مشینوں میں دُعاؤں کے شجر یاد آئے

شام کے بعد کچہری کا تھکا کا سناٹا
بے گناہی کو عدالت کے ہنر یاد آئے

میرے سینے میں کوئی سانس چبھا کرتی ہے
جیسے مزدور کو پردیس میں گھر یاد آئے

کتنے خط آئے گئے شاخ پہ پھولوں کی طرح
آج دریا میں چراغوں کے سفر یاد آئے

☼

اندھیرے راستوں میں یوں تری آنکھیں چمکتی ہیں
خدا کی برکتیں جیسے پہاڑوں پر اُترتی ہیں

محبت کرنے والے جب کبھی آنسو بہاتے ہیں
دِلوں کے آئینے دھوتی ہوئی پلکیں سنورتی ہیں

دُھواں سی بدلیوں کو دیکھ کر اکثر وہ کہتی تھی
ہمیشہ چاندنی میں بے وفا روحیں بھٹکتی ہیں

ہماری زندگی میں پھول بن کر کوئی آیا تھا
اسی کی یاد میں اب تک یہ تحریریں مہکتی ہیں

مجھے لگتا ہے دل کھینچ کر چلا آتا ہے ہاتھوں پر
تجھے لکھوں تو میری انگلیاں ایسی دھڑکتی ہیں

☼

اُداس آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے ہیں
یہ موتیوں کی طرح سیپیوں میں پلتے ہیں

گھنے دُھوئیں میں فرشتے بھی آنکھ ملتے ہیں
تمام رات کھجوروں کے پیڑ جلتے ہیں

میں شاہراہ نہیں راستے کا پتھر ہوں
یہاں سوار بھی پیدل اُتر کے چلتے ہیں

انھیں کبھی نہ بتانا میں اُن کی آنکھوں میں
وہ لوگ پھول سمجھ کر مجھے مسلتے ہیں

کئی ستاروں کو میں جانتا ہوں بچپن سے
کہیں بھی جاؤں مرے ساتھ چلتے ہیں

یہ ایک پیڑ ہے آ اس سے مل کے رو لیں ہم
یہاں سے تیرے مرے راستے بدلتے ہیں

☼

آندھیوں کے ساتھ کیا منظر سہانے آئے ہیں
آج میدانوں میں باغوں کے خزانے آئے ہیں

اب مرے تلوؤں کے نیچے کی زمین آزاد ہے
آسمانوں سے مجھے بادل بلانے آئے ہیں

ریت سے دریا اُٹے ہیں خاک سے جھیلیں پٹیں
یہ پرندے خون میں شاید نہانے آئے ہیں

خواب جس دل میں رہا کرتے تھے کب کا مر چکا
کس کا دروازہ یہ بچے کھٹکھٹانے آئے ہیں

ان میں روشن ہیں ابھی تک تیرے بوسوں کے چراغ
اس لیے ہم اپنی آنکھیں خود بجھانے آئے ہیں

گرتی دیواروں سے لگ کر دیمکوں کے قافلے
کچھ صحیفے اپنی آنکھوں سے لگانے آئے ہیں

آج ہم سب ایک بہتر زندگی کی دوڑ میں
کیسے کیسے خواب قبروں میں سلانے آئے ہیں

بارہا اس گھر کا بٹوارہ ہوا اور آج تک
اپنے حصّے میں سدا دُکھ کے خزانے آئے ہیں

چار دُشمن آملے ہیں رات کی چھت کے تلے
مدتوں کے بعد پھر اگلے زمانے آئے ہیں

☼

ہونٹوں پہ محبت کے فسانے نہیں آتے
ساحل پہ سمندر کے خزانے نہیں آتے

پلکیں بھی چمک اُٹھتی ہیں سوتے میں ہماری
آنکھوں کو ابھی خواب چھپانے نہیں آتے

دل اُجڑی ہوئی ایک سرائے کی طرح ہے
اب لوگ یہاں رات جگانے نہیں آتے

یارو نئے موسم نے یہ احسان کیے ہیں
اب یاد مجھے درد پرانے نہیں آتے

اسکول کی دیوار میں دروازے بھی رکھیے
پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے

اس شہر کے بادل تری زلفوں کی طرح ہیں
یہ آگ لگاتے ہیں بجھانے نہیں آتے

احباب بھی غیروں کی ادا سیکھ گئے ہیں
آتے ہیں مگر دل کو دِکھانے نہیں آتے

☼

ان کو آئینہ بنایا دُھوپ کا چہرہ مجھے
راستہ پھولوں کا سب کو آگ کا دریا مجھے

چاند چہرہ، زلف دریا، بات خوشبو، دل چمن
اِک تمھیں دے کر خدا نے دے دیا کیا کیا مجھے

جس طرح واپس کوئی لے جائے اپنی چھٹیاں
جانے والا اس طرح سے کر گیا تنہا مجھے

تم نے دیکھا ہے کسی میرا کو مندر میں کبھی
ایک دن اس نے خدا سے اس طرح مانگا مجھے

میری مٹھی میں سلگتی ریت رکھ کر چل دیا
کتنی آوازیں دیا کرتا تھا یہ دریا مجھے

☼

سنسان راستوں سے سواری نہ آئے گی
اب دُھول سے اَٹی ہوئی لاری نہ آئے گی

چھپّر کے چائے خانے بھی اب اونگھنے لگے
پیدل چلو کہ کوئی سواری نہ آئے گی

تحریر و گفتگو میں کسے ڈھونڈتے ہیں لوگ
تصویر میں بھی شکل ہماری نہ آئے گی

سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا
آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی

پہچان اپنی ہم نے مٹائی ہے اس طرح
بچوں میں کوئی بات ہماری نہ آئے گی

میری آنکھوں میں غم کی نشانی نہیں
پتھروں کے پیالوں میں پانی نہیں

میں تجھے بھول کر بھی نہیں بھولتا
پیار سونا ہے سونے کا پانی نہیں

میری اپنی بھی مجبوریاں ہیں بہت
میں سمندر ہوں پینے کا پانی نہیں

میرا چہرہ لکیروں میں تقسیم ہے
آئینوں سے مجھے بدگمانی نہیں

شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں
اب مرے پاس کوئی کہانی نہیں

موسموں کے لفافے بدلتے رہے
کوئی تحریر اتنی پرانی نہیں

کوئی آسیب ہے اس حسیں شہر پر
شام روشن ہے لیکن سہانی نہیں

☼

اس طرح ساتھ نبھنا ہے دُشوار سا
میں بھی تلوار سا ، تو بھی تلوار سا

اپنا رنگِ غزل ، اس کے رخسار سا
دل چمکنے لگا ہے رخِ یار سا

اب ہے ٹوٹا سا دل خود سے بیزار سا
اس حویلی میں لگتا تھا دربار سا

خوبصورت سی پیروں میں زنجیر ہو
گھر میں بیٹھا رہوں میں گرفتار سا

میں فرشتوں کی صحبت کے لائق نہیں
ہم سفر کوئی ہوتا گنہگار سا

گڑیا گڈے کو بیچا خریدا گیا
گھر سجایا گیا رات بازار سا

شام تک کتنے ہاتھوں سے گزروں گا میں
چائے خانے میں اُردو کے اخبار سا

بات کیا ہے کہ مشہور لوگوں کے گھر
موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

زینہ زینہ اُترتا ہوا آئینہ
اس کا لہجہ انوکھا کھنک دار سا

☼

اس طرح دنیا ملی شکوہ گلہ کوئی نہیں
میں سمجھتا تھا مرا تیرے سوا کوئی نہیں

خط نہیں ہوں جس پہ تم راہوں کی تفصیلیں لکھو
اس کے گھر جاؤں گا میں جس کا پتہ کوئی نہیں

ایسا لگتا ہے کہ تو مجھ سے جدا ہو جائے گا
تیرے میرے درمیاں اب فاصلہ کوئی نہیں

اب تمھیں سچی محبت کا یقیں آجائے گا
اس بڑے شہرِ وفا میں بے وفا کوئی نہیں

میں پیمبر تو نہیں لیکن مجھے احساس ہے
ان بُرے لوگوں میں بھی مجھ سے بُرا کوئی نہیں

☼

دوسروں کو ہماری سزائیں نہ دے
چاندنی رات کو بددعائیں نہ دے

پھول سے عاشقی کا ہنر سیکھ لے
تتلیاں خود رُکیں گی صدائیں نہ دے

سب گناہوں کا اقرار کرنے لگیں
اس قدر خوب صورت سزائیں نہ دے

میں درختوں کی صف کا بھکاری نہیں
بے وفا موسموں کی قبائیں نہ دے

موتیوں کو چھپا سیپیوں کی طرح
بے وفاؤں کو اپنی وفائیں نہ دے

میں بکھر جاؤں گا آنسوؤں کی طرح
اس قدر پیار سے بددعائیں نہ دے

سر پہ سایہ سا دست دُعا یاد ہے
اپنے آنگن میں اِک پیڑ تھا، یاد ہے

جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی
تم کو اسکول کی وہ دُعا یاد ہے

ایسا لگتا ہے ہر امتحاں کے لیے
زندگی کو ہمارا پتہ یاد ہے

میکدے میں اذاں سن کے رویا بہت
اس شرابی کو دل سے خدا یاد ہے

میں پرانی حویلی کا پردہ مجھے
کچھ کہا یاد ہے کچھ سنا یاد ہے

☼

اِک شہر تھا خراب جہاں کوئی بھی نہ تھا
ہم لوٹ آئے ہم سا وہاں کوئی بھی نہ تھا

لَو کی طرح چراغ کا قیدی نہیں ہوں میں
اچھا ہوا کہ اپنا مکاں کوئی بھی نہ تھا

دل پر جمی تھیں گردِ سفر کی کئی تہیں
کاغذ پہ انگلیوں کا نشاں کوئی بھی نہ تھا

وہ محفلوں کی جان ہے ، دُنیا کے واسطے
مجھ سے وہاں ملا ہے جہاں کوئی بھی نہ تھا

سنّاٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

☼

پتھر کے جگر والو ، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا ، بہتا ہوا پانی ہے

پھولوں میں غزل رکھنا یہ رات کی رانی ہے
اس میں تری زلفوں کی بے ربط کہانی ہے

اِک ذہنِ پریشاں میں وہ پھول سا چہرہ ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے

کیوں چاندنی راتوں میں دریا پہ نہاتے ہو
سوئے ہوئے پانی میں کیا آگ لگانی ہے

اس حوصلۂ دل پر ہم نے بھی کفن پہنا
ہنس کر کوئی پوچھے گا کیا جان گنوانی ہے

رونے کا اثر دل پر رہ رہ کے بدلتا ہے
آنسو کبھی شیشہ ہے ، آنسو کبھی پانی ہے

یہ شبنمی لہجہ ہے ، آہستہ غزل پڑھنا
تتلی کی کہانی ہے پھولوں کی زبانی ہے

☼

مسکراتی ہوئی دھنک ہے وہی
اس بدن میں چمک دمک ہے وہی

پھول کمھلا گئے اُجالوں کے
سانولی شام میں نمک ہے وہی

اب بھی چہرہ چراغ لگتا ہے
بجھ گیا ہے مگر چمک ہے وہی

وہ سراپا دیے کی لَو جیسا
میں ہَوا ہوں ادھر لپک ہے وہی

کوئی شیشہ ضرور ٹوٹا ہے
گنگناتی ہوئی کھنک ہے وہی

پیار کس کا ملا ہے مٹّی میں
اس چنبیلی تلے مہک ہے وہی

☼

بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی
یہ دُنیا دُلہن ہے جلائی ہوئی

بھری دوپہر کا کھلا پھول ہے
پسینے میں لڑکی نہائی ہوئی

کرن پھول کی پتیوں میں دبی
ہنسی اس کے ہونٹوں پہ آئی ہوئی

وہ چہرہ کتابی رہا سامنے
بڑی خوبصورت پڑھائی ہوئی

خوشی ہم غریبوں کی کیا ہے میاں
مزاروں پہ چادر چڑھائی ہوئی

اُداسی بچھی ہے بڑی دُور تک
بہاروں کی بیٹی پرائی ہوئی

☼

کس نے مجھ کو صدا دی بتا کون ہے
اے ہوا تیرے گھر میں چھپا کون ہے

بارشوں میں کسی پیڑ کو دیکھنا
شال اوڑھے ہوئے بھیگتا کون ہے

خوشبوؤں میں نہائی ہوئی شاخ پر
پھول سا مسکراتا ہوا کون ہے

میں یہاں دُھوپ میں تپ رہا ہوں مگر
وہ پسینے میں ڈوبا ہوا کون ہے

دل کو پتھر ہوئے اِک زمانہ ہوا
اس مکاں میں مگر بولتا کون ہے

آسمانوں کو ہم نے بتایا نہیں
ڈوبتی شام میں ڈوبتا کون ہے

تم بھی مجبور ہو ہم بھی مجبور ہیں
بے وفا کون ہے، باوفا کون ہے

☼

ہر بات میں مہکے ہوئے جذبات کی خوشبو
یاد آئی بہت پہلی ملاقات کی خوشبو

چھپ چھپ کے نئی صبح کا منہ چوم رہی ہے
ان ریشمی زلفوں میں بسی رات کی خوشبو

موسم بھی حسینوں کی ادا سیکھ گئے ہیں
بادل ہیں چھپائے ہوئے برسات کی خوشبو

گھر کتنے ہی چھوٹے ہوں گھنے پیڑ ملیں گے
شہروں سے الگ ہوتی ہے قصبات کی خوشبو

ہونٹوں پہ ابھی پھول کی پتی کی مہک ہے
سانسوں میں رچی ہے تری سوغات کی خوشبو

☼

دُعا کرو کہ یہ پودا سدا ہرا ہی لگے
اُداسیوں میں بھی چہرہ کھلا کھلا ہی لگے

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھول ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

حسیں تو اور بھی ہیں پر کوئی کہاں تجھ سا
جو دل جلائے بہت پھر بھی دلربا ہی لگے

☼

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

اُتر بھی آؤ کبھی آسماں کے زینے سے
تمھیں خدا نے ہمارے لیے بنایا ہے

کہاں سے آئی یہ خوشبو، یہ گھر کی خوشبو ہے
اس اجنبی کے اندھیرے میں کون آیا ہے

مہک رہی ہے زمیں چاندنی کے پھولوں سے
خدا کسی کی محبت پہ مسکرایا ہے

اسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں
اسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا
وہ اِک چراغ جو میں نے کبھی بجھایا ہے

☼

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے تیرے شہر والوں میں

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

رات تیری یادوں نے دل کو اس طرح چھیڑا
جیسے کوئی چٹکی لے نرم نرم گالوں میں

یوں کسی کی آنکھوں میں صبح تک ابھی تھے ہم
جس طرح رہے شبنم پھول کے پیالوں میں

میری آنکھ کے تارے اب نہ دیکھ پاؤ گے
رات کے مسافر تھے کھو گئے اُجالوں میں

☼

وہ مہکتی پلکوں کی اوٹ سے کوئی تارا چمکتا تھا رات میں
مری بند مٹھی نہ کھولیے وہی کوہِ نور ہے ہات میں

میں تمام تارے اُٹھا اُٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دیں مرے بات میں

ابھی شام تک مرے باغ میں کہیں کوئی پھول کھلا نہ تھا
مجھے خوشبوؤں میں بسا گیا ترا پیار ایک ہی رات میں

ترے ساتھ اتنے بہت سے دن تو پلک جھپکتے گزر گئے
ہوئی شام کھیل ہی کھیل میں گئی رات بات ہی بات میں

کوئی عشق ہے کہ اکیلا ریت کی شال اوڑھ کے چل دیا
کبھی بال بچوں کے ساتھ آ، یہ پڑاؤ لگتا ہے رات میں

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دُھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

☼

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اُتار لوں

میں تمام دن کا تھکا ہوا تو تمام شب کا جگا ہوا
ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر تیرے ساتھ شام گزار لوں

اگر آسماں کی نمائشوں میں مجھے بھی اذنِ قیام ہو
تو میں موتیوں کی دُکان سے تری بالیاں ترے ہار لوں

کہیں اور بانٹ دے شہرتیں کہیں اور بخش دے عزتیں
میرے پاس ہے مرا آئینہ میں کبھی نہ گرد و غبار لوں

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنھیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

☼

کبھی یوں بھی آ مری آنکھ میں کہ میری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو

وہ بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دُعا کروں تو مری دُعا میں اثر نہ ہو

مرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی محوِ خواب ہے چاندنی
نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی آہٹوں کا گزر نہ ہو

یہ غزل کہ جیسے ہرن کی آنکھ میں پچھلی رات کی چاندنی
نہ بجھے خرابے کی روشنی کبھی بے چراغ یہ گھر نہ ہو

کبھی دن کی دُھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول کو چوم کے
یوں ہی ساتھ ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

☼

خاک جب خاکسار لگتی ہے
کس قدر باوقار لگتی ہے

خون پانی بنا کے پیتی ہے
دُھوپ سرمایہ دار لگتی ہے

صبر کر، صبر کرنے والوں کی
بے بسی شاندار لگتی ہے

اب بجھادو ہماری آنکھیں بھی
روشنی ناگوار لگتی ہے

رَت جگوں کی بڑی حویلی اب
جنگلوں کا مزار لگتی ہے

آج کل میرے پاؤں کے نیچے
کوئی شے جاندار لگتی ہے

صرف اخبار پڑھنے والوں کو
زندگی اشتہار لگتی ہے

گرم موسم میں گرم چائے بھی
بدمزاجوں کا پیار لگتی ہے

☼

سوئے کہاں تھے آنکھوں نے تکیے بھگوئے تھے
ہم بھی کبھی کسی کے لیے خوب روئے تھے

انگنائی میں کھڑے ہوئے بیری کے پیڑ سے
وہ لوگ چلتے وقت گلے مل کے روئے تھے

ہر سال زرد پھولوں کا اِک قافلہ رُکا
اس نے جہاں پہ دُھول اَٹے پاؤں دھوئے تھے

اس حادثے سے میرا تعلّق نہیں کوئی
میلے میں ایک سال کئی بچے کھوئے تھے

آنکھوں کی کشتیوں میں سفر کر رہے ہیں وہ
جن دوستوں نے دل کے سفینے ڈبوئے تھے

کل رات میں تھا میرے علاوہ کوئی نہ تھا
شیطان مر گیا تھا، فرشتے بھی سوئے تھے

☼

آنسوؤں کے ساتھ سب کچھ بہہ گیا
دل میں سناٹا سا ، باقی رہ گیا

چھوڑ آیا ہوں زمین و آسمان
فاصلہ اب اور کتنا رہ گیا

رفتہ رفتہ بجھ گئے سارے چراغ
اِک چہرہ جھلملاتا ، رہ گیا

بستیاں دُھندلا گئیں پھر کھو گئیں
روشنی کا شہر پیچھے رہ گیا

☼

کہاں آنکھوں کی یہ سوغات ہوگی
نئے لوگ ہوں گے نئی بات ہوگی

میں ہر حال میں مسکراتا رہوں گا
تمھاری محبت اگر ساتھ ہوگی

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا
بڑی دُور تک رات ہی رات ہوگی

نہ تم ہوش میں ہو نہ ہم ہوش میں ہیں
چلو میکدے میں وہیں بات ہوگی

چراغوں کی لَو سے ستاروں کی ضوتک
تمھیں میں ملوں گا جہاں رات ہوگی

جہاں وادیوں میں نئے پھول آئے
ہماری تمھاری ملاقات ہوگی

صداؤں کو الفاظ ملنے نہ پائیں
نہ بادل گھریں گے نہ برسات ہوگی

مسافر ہیں ہم بھی، مسافر ہو تم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

پتّوں کا دُکھ کھوج رہے ہو اُڑنے والے پنچھی میں
آنسو تو پل بھر کا مسافر پلکوں کی اس کشتی میں

ہر چہرے میں تیرا چہرہ ڈھونڈ کے تجھ کو کھو بیٹھے
گھر کا رستہ بھول گئے ہم گھر آنے کی جلدی میں

اِک اِک گھر کا نام اور نمبر پوچھ کے دن بھی ڈوب چلا
بیلوں کے سائے کے پیچھے شام کھڑی تھی کھڑکی تھی

وہ تتلی تھی دیے کی لَو کو پھول سمجھ کر بیٹھ گئی
جب چاندی سے بال نظر آئے بچی کو کنگھی میں

وہ اَن پڑھ تھا پھر بھی اس نے پڑھے لکھے لوگوں سے کہا
اِک تصویر کئی خط بھی ہیں صاحب آپ کی ردّی میں

بے موسم آنکھوں کی بدلی ہم کو نہیں اچھی لگتی ہے
دُھواں دُھواں گھر ہو جاتا ہے ساون کی گیلی لکڑی میں

آ میرے سینے پر سر رکھ اپنے کان سے سن پگلی
میرے بھگون بول رہے ہیں من مندر کی گھنٹی میں

☼

شام آنکھوں میں آنکھ پانی میں
اور پانی سرائے فانی میں

جھلملاتے ہیں کشتیوں میں دیے
پل کھڑے سو رہے ہیں پانی میں

خاک ہو جائے گی زمیں اِک دن
آسمانوں کی آسمانی میں

وہ ہوا ہے اسے کہاں ڈھونڈوں
آگ میں خاک میں کہ پانی میں

آ پہاڑوں کی طرح سامنے آ
ان دنوں میں بھی ہوں روانی میں

راتوں کے مسافر ہو اندھیروں میں رہو گے
جگنو کی طرح دن میں جلو گے نہ بجھو گے

سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو
تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہو گے

کیا اُن کہی غزلوں کی کتابیں ہیں وہ آنکھیں
جب پڑھ نہیں سکتے ہو تو کیا خاک لکھو گے

خوشبو کی حویلی ہے مرے دل کی زمیں پر
وعدہ کرو اِک روز مرے ساتھ چلو گے

دلّی ہو کہ لاہور، کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے

☼

راہوں میں کون آیا گیا کچھ پتہ نہیں
اس کو تلاش کرتے رہے جو ملا نہیں

بے آس کھڑکیاں ہیں ستارے اُداس ہیں
آنکھوں میں آج نیند کا کوسوں پتہ نہیں

میں چپ رہا تو اور غلط فہمیاں بڑھیں
وہ بھی سنا ہے اس نے جو میں نے کہا نہیں

دل میں اسی طرح سے ہے بچپن کی ایک یاد
شاید ابھی کلی کو ہوا نے چھوا نہیں

چہرے پہ آنسوؤں نے لکھی ہیں کہانیاں
آئینہ دیکھنے کا مجھے حوصلہ نہیں

☼

وہ غزل والوں کا اسلوب سمجھتے ہوں گے
چاند کہتے ہیں کسے خوب سمجھتے ہوں گے

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

میں سمجھتا تھا محبت کی زباں خوشبو ہے
پھول سے لوگ اسے خوب سمجھتے ہوں گے

دیکھ کر پھول کے اوراق پہ شبنم کچھ لوگ
ترا اشکوں بھرا مکتوب سمجھتے ہوں گے

بھول کر اپنا زمانہ ، یہ زمانے والے
آج کے پیار کو معیوب سمجھتے ہوں گے

☼

سورج ، چندا جیسی جوڑی ہم دونوں
دن کا راجہ ، رات کی رانی ہم دونوں

جگمگ جگمگ دُنیا کا میلہ جھوٹا
سچا سونا سچی چاندی ہم دونوں

اِک دوجے سے مل کر پورے ہوتے ہیں
آدھی آدھی ایک کہانی ہم دونوں

چاروں اور سمندر بڑھتی چنتا کا
لہر لہر لہراتی کشتی ہم دونوں

پربت پربت ، بادل بادل کرن کرن
اُجلے پر والے دو پنچھی ہم دونوں

میں دہلیز کا دیپک ہوں آ تیز ہوا
رات گزاریں اپنی اپنی ہم دونوں

گھر گھر دکھ سکھ کا اِک دیپک جلے بجھے
ہر دیپک میں تیل اور باتی ہم دونوں

دنیا کی یہ مایا کنکر پتھر ہے
آنسو ، شبنم ، ہیرا موتی ہم دونوں

☼

اس کی آنکھوں سا اس کے گیسو سا
میرا سارا کلام خوشبو سا

میری پلکوں پہ جھلملاتا ہے
رات بھر ایک نام جگنو سا

کتنی مدت کے بعد تجھ سے ملے
مسکراتا ہے پیار آنسو سا

آج وعدہ کسی کا ٹوٹ گیا
ریشمی تتلیوں کے بازو سا

روز تنہائیوں میں اِک چہرہ
تولتا ہے مجھے ترازو سا

☼

گھر سے نکلے اگر ہم بہک جائیں گے
وہ گلابی کٹورے چھلک جائیں گے

ہم نے الفاظ کو آئینہ کردیا
چھپنے والے غزل میں چمک جائیں گے

دُشمنی کا سفر اِک قدم دو قدم
تم بھی تھک جاؤ گے ہم بھی تھک جائیں گے

رفتہ رفتہ ہر اِک زخم بھر جائے گا
سب نشانات پھولوں سے ڈھک جائیں گے

نام پانی پہ لکھنے سے کیا فائدہ
لکھتے لکھتے ترے ہاتھ تھک جائیں گے

یہ پرندے بھی کھیتوں کے مزدور ہیں
لوٹ کے اپنے گھر شام تک جائیں گے

دن میں پریوں کی کوئی کہانی نہ سن
جنگلوں میں مسافر بھٹک جائیں گے

☼

سویرے ستاروں کی شبنم کہاں
ذرا دیر میں تم کہاں ، ہم کہاں

اُداسی کے ساون برس دو برس
جوانی گئی پھر یہ موسم کہاں

مسافر کو آنگن کے پھولوں سے کیا
ہوا کی ہتھیلی پہ شبنم کہاں

ہمار بدن دُھوپ کا باغ ہے
یہاں چاندنی اور شبنم کہاں

شکستوں کے ڈیرے منڈیروں پر ہیں
ہماری فصیلوں پہ پرچم کہاں

☼

فن اگر روح و دل کی ریاضت نہ ہو
ایسی مسجد ہے جس میں عبادت نہ ہو

تیری آنکھوں میں ایسا سنور جاؤں میں
عمر بھر آئینوں کی ضرورت نہ ہو

کس کو نیلام کرتے ہو بازار میں
یہ کسی گھر کے مندر کی مورت نہ ہو

دلنوازی کا فن جاننا چاہیے
حسن چاہے بہت خوب صورت نہ ہو

دن تو نکلا خریدا ہوا آدمی
اے خدا رات بھی سب کی عورت نہ ہو

چھپّروں پر دیے رکھ گئی ہے ہوا
تاکہ پھر روشنی کی شکایت نہ ہو

☼

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

تم جنھیں پھول سمجھے ہو آنکھیں نہ ہوں
پاؤں رکھنا زمیں پر ذرا دیکھ کر

پھر دیے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں
آج دروازہ دل کا کھلا دیکھ کر

اس کی آنکھوں کا ساون برسنے لگا
بادلوں میں پرندہ گھرا دیکھ کر

شام گہری ہوئی اور گھر دور ہے
پھول سو جائیں گے راستہ دیکھ کر

پھول سی انگلیاں کنگھیاں بن گئیں
اُلجھے بالوں سے ماتھا ڈھکا دیکھ کر

☼

میکدہ ، رات غم کا گھر نکلا
دل ، حویلی تلے کھنڈر نکلا

میں اسے ڈھونڈتا تھا آنکھوں میں
پھول بن کر وہ شاخ پر نکلا

کس کے سائے میں سر چھپاؤ گے
وہ شجر ، دُھوپ کا شجر نکلا

اس کا آنچل بھی کوئی بادل تھا
وہ ہواؤں کا ہم سفر نکلا

کوئی کاغذ نہ تھا لفافے میں
صرف تتلی کا ایک پر نکلا

جب سے جانا کہ وہ بہادر ہیں
دل سے کچھ دشمنوں کا ڈر نکلا

زندگی اِک فقیر کی چادر
جب ڈھکے پاؤں ہم نے سر نکلا

☼

ہمارا دل سویرے کا سنہرا جام ہو جائے
چراغوں کی طرح آنکھیں جلیں جب شام ہو جائے

کبھی تو آسماں سے چاند اُترے جام ہو جائے
تمھارے نام کی اِک خوب صورت شام ہو جائے

عجب حالات تھے یوں دل کا سودا ہو گیا آخر
محبت کی حویلی جس طرح نیلام ہو جائے

سمندر کے سفر میں اس طرح آواز دے ہم کو
ہوائیں تیز ہوں اور کشتیوں میں شام ہو جائے

مجھے معلوم ہے اس کا ٹھکانہ پھر کہاں ہوگا
پرندہ آسماں چھونے میں جب ناکام ہو جائے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

☼

بھول شادی بہت بڑی کرلی
ہم نے دُنیا سے دوستی کرلی

تم محبت کو کھیل کہتے ہو
ہم نے برباد زندگی کرلی

سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا
آنکھوں آنکھوں میں بات بھی کرلی

عاشقی میں بہت ضروری ہے
بے وفائی کبھی کبھی کرلی

ہم نہیں جانتے چراغوں نے
کیوں اندھیروں سے دوستی کرلی

دھڑکنیں ، دفن ہوگئی ہوں گی
دل میں دیوار کیوں کھڑی کرلی

☼

موم کی زندگی گھلا کرنا
کچھ کسی سے نہ تذکرہ کرنا

میرا بچپن تھا آئینے جیسا
ہر کھلونے کا منہ تکا کرنا

ایک لڑکی تھی کھیل تھا اس کا
گڑیا گڈوں کا سلسلہ کرنا

پھول شاخوں کے ہوں کہ آنکھوں کے
راستے راستے چُنا کرنا

یہ روایت بہت پرانی ہے
نیند میں آگ پر چلا کرنا

راستے میں کوئی کھنڈر ہوگا
شہسوارو ، وہاں رُکا کرنا

☼

بے وفا راستے بدلتے ہیں
ہم سفر ساتھ ساتھ چلتے ہیں

کس کے آنسو چھپے ہیں پھولوں میں
چومتا ہوں تو ہونٹ جلتے ہیں

اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھو
مندروں میں چراغ جلتے ہیں

دل میں رہ کر نظر نہیں آتے
ایسے کانٹے کہاں نکلتے ہیں

اِک دیوار وہ بھی شیشے کی
دو بدن پاس پاس جلتے ہیں

وہ ستارے مرے ستارے ہیں
جو بھری دُھوپ میں نکلتے ہیں

کانچ کے، موتیوں کے، آنسو کے
سب کھلونے غزل میں ڈھلتے ہیں

☼

اسے فن نہیں پردۂ فن کہو
غزل کو چراغوں کی چلمن کہو

انھیں میں سنورتے رہو عمر بھر
سدا میری آنکھوں کو درپن کہو

وہ جب چاہے سرسبز کردے مجھے
مرے واسطے اس کو ساون کہو

قدم چاند سے میرے دل پر رکھو
اسے بھی کبھی گھر کا آنگن کہو

جواں ہو کے مل جائیں گے خاک میں
گلوں کو شہیدوں کا بچپن کہو

کئی باغ ہیں اس زمیں کے تلے
مرے دل کو یادوں کا مدفن کہو

ستاروں کے دھبےّ کھلا آسماں
اسے بھی شرابی کا دامن کہو

☼

تمام آگ ہے دل راہ خار و خس کی نہیں
یہی گلی ہے جہاں سلطنت ہوس کی نہیں

وہ سب کے سامنے بانہوں میں آ کے کھو جانا
فرشتوں جیسی یہ معصومیت ہوس کی نہیں

بس ایک شام کی لذّت بہت غنیمت جان
عظیم پاک محبت، ہر اِک کے بس کی نہیں

تھا ایک شخص ہر اِک شخص اس پہ عاشق تھا
یہ بات کل کی ہے دو چار دس برس کی نہیں

نصاب دل کا کہاں رکھ دیا کلاسوں میں
غزل کی آگ ہے یہ کاغذوں کے بس کی نہیں

☼

یوں دل کو گدگدایا ، ہر غم جگا دیا ہے
اس نے ہنسی ہنسی میں ہم کو رُلا دیا ہے

پوچھا بہت جو ہم نے کس اور اب ملو گے
چٹکی میں ریت لے کر اس نے اُڑا دیا ہے

کل شب عجب ہوا تھی بجھتے دیے کی لَو میں
وہ آنسوؤں کا کاغذ ہم نے جلا دیا ہے

روشن تھے رات ہم سے خیمے مسافروں کے
دن کے سفر میں سب نے ہم کو بھلا دیا ہے

جن کاغذوں پہ دل کی قیمت لکھی ہوئی تھی
ان دیمکوں کو کس نے ان کا پتہ دیا ہے

☼

شام کے پیڑ کی سرمئی شاخ پر پتیوں میں چھپا کوئی جگنو بھی ہے
ساحلوں پر پڑی سیپیوں میں کہیں جھلملاتا ہوا ایک آنسو بھی ہے

آندھیاں راکھ کے ڈھیر لیتی گئیں، چمکیں چنگاریاں کونپلوں کی طرح
ان دِنوں زندگی پھر ہمارے لیے صبحِ عارض بھی ہے شامِ گیسو بھی ہے

اس پہاڑی علاقے میں اِک گاؤں کے موڑ پر آتی جاتی بسوں کے لیے
دو درختوں کی مشفق گھنی چھاؤں میں گرم چائے کی مانوس خوشبو بھی ہے

ان نہاتے پرندوں کے ہمراہ اب میں بھی آکاش سر پر اُٹھا لاؤں گا
ندیوں میں نہا کر تھکن ڈھل گئی کچھ درختوں کی بانہوں کا جادو بھی ہے

میرے دشمن میری جستجو میں ابھی اس کمیں گاہ کو آگ دکھلائیں گے
اب یہ بہتر ہے میں خود ہی آگے بڑھوں، جھاڑیوں میں یہاں ایک آہو بھی ہے

☼

جہاں پیڑ پر چار دانے لگے
ہواؤ ہوس کے نشانے لگے

ہوئی شام یادوں کے اِک گاؤں سے
پرندے اُداسی کے آنے لگے

گھڑی دو گھڑی مجھ کو پلکوں پہ رکھ
یہاں آتے آتے زمانے لگے

کبھی بستیاں دل کی یوں بھی بسیں
دُکانیں کھلیں ، کار خانے لگے

وہیں زرد پتّوں کا قالین ہے
گلوں کے جہاں شامیانے لگے

پڑھائی ، لکھائی کا موسم کہاں
کتابوں میں خط آنے جانے لگے

☼

مسافر کے رستے بدلتے رہے
مقدر میں چلنا تھا چلتے رہے

مرے راستوں میں اُجالا رہا
دِیے اس کی آنکھوں میں جلتے رہے

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا
مرے پاؤں شعلوں پہ چلتے رہے

سنا ہے انھیں بھی ہوا لگ گئی
ہواؤں کے جو رُخ بدلتے رہے

وہ کیا تھا جسے ہم نے ٹھکرا دیا
مگر عمر بھر ہاتھ ملتے رہے

محبت ، عداوت ، وفا ، بے رُخی
کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

لپٹ کر چراغوں سے وہ سو گئے
جو پھولوں پہ کروٹ بدلتے رہے

ریشم کی چادر اوڑھی پگڑی باندھی
دامن میں دروازے کی مٹّی باندھی

ریل کی پٹری پر میری شہرت رکھ دی
بس کے پہیوں سے روزی روٹی باندھی

پلکوں میں جھلمل جھلمل ساون برسا
موسم نے بادل جیسی ساری باندھی

اس تلسی سے اُس کا رشتہ تھا کوئی
آنچل میں اس نے سوکھی پتی باندھی

پہلے سے کچھ صاف نظر آئی دُنیا
جب سے ہم نے آنکھوں پر پٹّی باندھی

☼

دل پہ چھایا رہا اُمس کی طرح
ایک لمحہ تھا سو برس کی طرح

وہ محبت کی طرح پگھلے گی
میں بھی مرجاؤں گا ہوس کی طرح

رات سر پر لیے ہوں جنگل میں
راستے کی خراب بس کی طرح

آتما بے زبان مینا ہے
اور ماٹی کا تن قفس کی طرح

خانقاہوں میں خاک اُڑتی ہے
اُردو والوں کے کیمپس کی طرح

موت کی وادیوں سے گزروں گا
میں پہاڑوں کی ایک بس کی طرح

☼

سرِ راہ کچھ بھی کہا نہیں کبھی اس کے گھر میں گیا نہیں
میں جنم جنم سے اسی کا ہوں اسے آج تک یہ پتہ نہیں

اسے پاک نظروں سے چومنا بھی عبادتوں میں شمار ہے
کوئی پھول لاکھ قریب ہو کبھی میں نے اس کو چھوا نہیں

یہ خدا کی دین عجیب ہے کہ اسی کا نام نصیب ہے
جسے تو نے چاہا وہ مل گیا جسے میں نے چاہا ملا نہیں

اسی شہر میں کئی سال سے مرے کچھ قریبی عزیز ہیں
انھیں میری کوئی خبر نہیں مجھے ان کا کوئی پتہ نہیں

☼

خواب ان آنکھوں سے اب کوئی چرا کر لے جائے
قبر کے سوکھے ہوئے پھول اٹھا کر لے جائے

منتظر پھول میں خوشبو کی طرح ہوں کب سے
کوئی جھونکے کی طرح آئے اُڑا کر لے جائے

یہ بھی پانی ہے مرا آنکھوں کا ایسا پانی
جو ہتھیلی سے رَچی مہندی چھڑا کر لے جائے

میں محبت سے مہکتا ہوا خط ہوں مجھ کو
زندگی اپنی کتابوں میں چھپا کر لے جائے

خاک انصاف ہے نابینا بتوں کے آگے
رات تھالی میں چراغوں کو سجا کر لے جائے

ان سے کہنا کہ میں پیدل نہیں آنے والا
کوئی بادل مجھے کاندھے پہ بٹھا کر لے جائے

☼

اب دِلوں کے علاوہ پڑھنا کیا
اپنا کاغذ قلم سے رشتہ کیا

آنسوؤں سے مری ہتھیلی پر
کون پڑھتا کہ اس نے لکھا کیا

اِک مہک جیسے رات کی رانی
کیا بتاؤں کہ میں نے سوچا کیا

جب بھی دیکھو اسی طرف نظریں
چاند بھی ہے کسی کا چہرہ کیا

پنکھڑی پنکھڑی سلام و پیام
پھول بھی ہے کوئی لفافہ کیا

جو نہ آدابِ دُشمنی جانے
دوستی کا اُسے سلیقہ کیا

تم مری زندگی ہو یہ سچ ہے
زندگی کا مگر بھروسہ کیا

☼

وہ شاید دِلوں کو دھڑکنے نہ دیں گے
گلوں سے مہکنے کا حق چھین لیں گے

ہمارے دِلوں کے دیے بجھ چکے ہیں
ہم آنکھوں کی تحریر کیسے پڑھیں گے

ہمارے بدن بھی ہمارے نہیں ہیں
اسے چھو کے محسوس کیسے کریں گے

لہو کا سمندر ہے پلکوں کے پیچھے
یہ روشن جزیرے لرزتے رہیں گے

سنہرے سنہرے پروں والے بادل
کھلے گیسوؤں کی مہک لے اُڑیں گے

کبھی سبز ساون کبھی زرد جاڑے
درختوں کے کپڑے بدلتے رہیں گے

جنھیں روشنی کا بدن اوڑھنا ہے
وہ کہرے کی چادر لپیٹے ملیں گے

وسیلہ ہے انساں رازق خدا ہے
جو در بند ہوں گے دریچے کھلیں گے

ازل سے ابد تک سفر ہی سفر ہے
مسافر ہیں سب لوگ چلتے رہیں گے

☼

یہ چراغ بے نظر ہے یہ ستارہ بے زباں ہے
ابھی تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے

وہی شخص جس پہ اپنے دل و جاں نثار کر دوں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے

کبھی پا کے تجھ کو کھونا، کبھی کھو کے تجھ کو پانا
یہ جنم جنم کا رشتہ ترے میرے درمیاں ہے

مرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دُکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسماں ہے

میں اسی گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر، مرا پیار جاوداں ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

اُداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا
ہزاروں جگنوؤں سے بھی اندھیرا کم نہیں ہوتا

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی نم نہیں ہوتا

بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی
اسے بھی غم نہیں ہوتا، مجھے بھی غم نہیں ہوتا

یہ آنسو ہیں، انھیں پھولوں میں شبنم کی طرح رکھنا
غزل احساس ہے احساس کا ماتم نہیں ہوتا

☼

اب کسے چاہیں کسے ڈھونڈھا کریں
وہ بھی آخر مل گیا اب کیا کریں

ہلکی ہلکی بارشیں ہوتی رہیں
ہم بھی پھولوں کی طرح بھیگا کریں

آنکھ موندے اس گلابی دُھوپ میں
دیر تک بیٹھے اسے سوچا کریں

دل ، محبت ، دین ، دنیا ، شاعری
ہر دریچے سے تجھے دیکھا کریں

گھر نیا ، کپڑے نئے ، برتن نئے
ان پرانے کاغذوں کا کیا کریں

☼

یہ کسک دل کی، دل میں چھپی رہ گئی
زندگی میں تمھاری کمی رہ گئی

ایک میں، ایک تم، ایک دیوار تھی
زندگی آدھی آدھی بٹی رہ گئی

رات کی بھیگی بھیگی چھتوں کی طرح
میری پلکوں پہ تھوڑی نمی رہ گئی

میرے گھر کی طرف دُھوپ کی پیٹھ تھی
آتے آتے اِدھر چاندنی رہ گئی

ریت پر آنسوؤں نے ترے نام کی
جو کہانی لکھی بے پڑھی رہ گئی

میں نے روکا نہیں وہ چلا بھی گیا
بے بسی دُور تک دیکھتی رہ گئی

☼

اسی لیے تو یہاں اب بھی اجنبی ہوں میں
تمام لوگ فرشتے ہیں آدمی ہوں میں

ضعیف بوڑھی جو ئپل پر اُداس بیٹھی ہے
اسی کی آنکھ میں لکھا ہے زندگی ہوں میں

ہے پکّی عمروں کی اِک بے زبان سی لڑکی
اسی کا رشتہ ہوں اور وہ بھی آخری ہوں میں

تمام رات چراغوں میں مسکراتی تھی
وہ اب نہیں ہے مگر اس کی روشنی ہوں میں

کہیں میں اور تھا مغرب کی جو اذاں نہ سنی
ان آنسوؤں میں سحر کی نماز بھی ہوں میں

ستارے راہ کے ہیں میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ
قلم ہوں بچّے کا، تختی نئی نئی ہوں میں

اگر وہ چاہیں تو زندہ جلا بھی سکتے ہیں
دُعا کے ہاتھ، حکومت کی بے بسی ہوں میں

☼

اُداسی کے چہرے پڑھا مت کرو
غزل آنسوؤں سے لکھا مت کرو

بہرحال یہ آگ ہی آگ ہیں
چراغوں کو ایسے چھوا مت کرو

دُعا، آنسوؤں میں کِھلا پھول ہے
کسی کے لیے بددعا مت کرو

تمھیں لوگ کہنے لگیں بے وفا
زمانے سے اتنی وفا مت کرو

اگر واقعی تم پریشان ہو
کسی اور سے تذکرہ مت کرو

خدا کے لیے چاندنی رات میں
اکیلے اکیلے پھرا مت کرو

☼

سوچا نہیں ، اچھا بُرا دیکھا سنا کچھ بھی نہیں
مانگا خدا سے رات دن تیرے سوا کچھ بھی نہیں

سوچا تجھے ، دیکھا تجھے ، چاہا تجھے ، پوجا تجھے
میری خطا میری وفا ، تیری خطا کچھ بھی نہیں

جس پر ہماری آنکھ نے موتی بچھائے رات بھر
بھیجا وہی کاغذ اُسے ہم نے لکھا کچھ بھی نہیں

اِک شام کے سائے تلے بیٹھے رہے وہ دیر تک
آنکھوں سے باتیں بہت منہ سے کہا کچھ بھی نہیں

احساس کی خوشبو کہاں آواز کے جگنو کہاں
خاموش یادوں کے سوا گھر میں رہا کچھ بھی نہیں

دو چار دن کی بات ہے دل خاک میں مل جائے گا
جب آگ پر کاغذ رکھا باقی بچا کچھ بھی نہیں

☼

وہ اپنے گھر چلا گیا افسوس مت کرو
اتنا ہی اس کا ساتھ تھا افسوس مت کرو

انسان اپنے آپ میں مجبور ہے بہت
کوئی نہیں ہے بے وفا افسوس مت کرو

اس بار تم کو آنے میں کچھ دیر ہوگئی
تھک ہار کے وہ سوگیا افسوس مت کرو

دنیا میں اور چاہنے والے بھی ہیں بہت
جو ہونا تھا وہ ہوگیا افسوس مت کرو

اس زندگی کے مجھ پہ کئی قرض ہیں مگر
میں جلد لوٹ آؤں گا افسوس مت کرو

یہ دیکھو پھر سے آگئیں پھولوں پہ تتلیاں
اِک روز وہ بھی آئے گا افسوس مت کرو

وہ تم سے آج دور ہے کل پاس آئے گا
پھر سے خدا ملائے گا افسوس مت کرو

بیکار جی پہ بوجھ لیے پھر رہے ہو تم
دل ہے تمھارا پھول سا افسوس مت کرو

☼

اِک چاند ہے کھویا کھویا سا سونی چھت پر تنہا تنہا
میں بھی ہوں اِدھر تنہا تنہا وہ بھی ہے اُدھر تنہا تنہا

دل کی تنہائی اور بڑھی مہمانوں کے آجانے سے
اِک تیرے آج نہ ہونے سے لگتا ہے گھر تنہا تنہا

مدت سے ریت کے صحرا میں آیا نہ گیا بادل کوئی
کس دیش گئے سارے پنچھی سوکھا ہے شجر تنہا تنہا

مرجھائے ہوئے چہرے پہ ہنسی جب آئی مجھ کو یاد آیا
بھولی بھٹکی شہزادی کا جنگل میں سفر تنہا تنہا

نرگس کے پھولوں میں چھپ کر پریوں کی آنکھیں روتی ہیں
یوں راتِ برات اکیلے میں جاؤ نہ اُدھر تنہا تنہا

☼

آس ہوگی نہ آسرا ہوگا
آنے والے دِنوں میں کیا ہوگیا

میں تجھے بھول جاؤں گا اِک دن
وقت سب کچھ بدل چکا ہوگا

نام ہم نے لکھا تھا آنکھوں میں
آنسوؤں نے مٹا دیا ہوگا

دم گھٹا جارہا ہے سینے میں
کوئی بجھتا ہوا دِیا ہوگا

آسماں بھر گیا پرندوں سے
پیڑ کوئی ہرا گرا ہوگا

پت جھڑوں کی کہانیاں پڑھنا
سارا منظر کتاب سا ہوگا

کتنا دُشوار تھا سفر اس کا
وہ سرِ شام سو گیا ہوگا

بھیگی ہوئی آنکھیں کا یہ منظر نہ ملے گا
گھر چھوڑ کے مت جاؤ کہیں گھر نہ ملے گا

پھر یاد بہت آئے گی زلفوں کی گھنی شام
جب دُھوپ میں سایہ کوئی سر پر نہ ملے گا

آنسو کو کبھی اوس کا قطرہ نہ سمجھنا
ایسا تمھیں چاہت کا سمندر نہ ملے گا

اس خواب کے ماحول میں بے خواب ہیں آنکھیں
جب نیند بہت آئے گی بستر نہ ملے گا

یہ سوچ لو اب آخری سایہ ہے محبت
اس در سے اُٹھو گے تو کوئی در نہ ملے گا

☼

فقیر آئینہ ہے، پردۂ خیال نہیں
مرے بدن پہ کسی مصلحت کی شال نہیں

یہ لوگ جیتے ہیں خوش فہمیوں کی قبروں میں
وطن پرستی کی اس سے بڑی مثال نہیں

زمین ماں بھی ہے، محبوب بھی ہے، بیٹی بھی
زمین چھوڑ کے جاؤں کوئی سوال نہیں

کہانیوں کا مقدر وہی ادھوراپن
کہیں فراق نہیں ہے کہیں وصال نہیں

بہت اُداس رہی زندگی تمھارے بعد
خیال تھا کہ تمھیں بھولنا محال نہیں

☼

ہم کو بے کار لیے پھرتے ہو بازاروں میں
ہم نہ یوسف ہیں نہ یوسف کے خریداروں میں

ملک تقسیم ہوئے دل تو سلامت ہیں ابھی
کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں

اِک زباں جس کو غزل کہیے وہ مجرم ٹھہری
شاہزادی کو چُنا جائے گا دیواروں میں

اِک حویلی میں چہکتے ہوئے پنچھی کی طرح
تیری آواز ابھی قید ہے درباروں میں

دُھوپ کی آگ میں ہنسنے کی ادا کیا جانیں
جنگلی پھول کہاں آپ کے گلزاروں میں

دل میں سو غم ہیں تری یاد ہے تنہا تنہا
ایک اُجلی سی پری پھرتی ہے بیماروں میں

عزّت و دولت و شہرت ہیں ہوا کی مانند
لال، نیلے، ہرے اُڑتے ہوئے غباروں میں

☼

میرا اس سے وعدہ تھا گھر رہنے کا
اپنی چھت کے نیچے دکھ سکھ سہنے کا

بارش بارش کچی قبر کا کُھلنا ہے
جاں لیوا احساس اکیلے رہنے کا

اب کے آنسو آنکھوں سے دل میں اُترے
رُخ بدلا دریا نے کیا بہنے کا

ہجر وصال کے سارے قصّے جھوٹے ہیں
حق ملتا ہے کس کو اپنا کہنے کا

جگمگ جگمگ ہیرے جیسی آنکھوں میں
ایک عجیب غبار حویلی ڈھہنے کا

☼

مجھ سے بچھڑ کے خوش رہتے ہو
میری طرح تم بھی جھوٹے ہو

اِک دیوار پہ چاند ٹکا تھا
میں یہ سمجھا تم بیٹھے ہو

اُجلے اُجلے پھول کھلے تھے
بالکل جیسے تم ہنستے ہو

مجھ سے شام بتا دیتی ہے
تم کیسے کپڑے پہنے ہو

دل کا حال پڑھا چہرے سے
ساحل سے لہریں گنتے ہو

تم تنہا دُنیا سے لڑو گے
بچوں سی باتیں کرتے ہو

☼

شبنم کے آنسو پھول پر یہ تو وہی قصہ ہوا
آنکھیں مری بھیگی ہوئی چہرہ ترا اُترا ہوا

اب ان دِنوں میری غزل خوشبو کی اِک تصویر ہے
ہر لفظ غنچے کی طرح کھل کر ترا چہرہ ہوا

شاید اسے بھی لے گئے اچھے دِنوں کے قافلے
اس باغ میں اِک پھول تھا تیری طرح ہنستا ہوا

ہر چیز ہے بازار میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
عزت گئی شہرت ملی رُسوا ہوئے چرچا ہوا

مندر گئے مسجد گئے پیروں فقیروں سے ملے
اِک اس کو پانے کے لیے کیا کیا، کیا کیا ہوا

انمول موتی پیار کے دُنیا چرا کر لے گئی
دل کی حویلی کا کوئی دروازہ تھا ٹوٹا ہوا

برسات میں دیوار و در کی ساری تحریریں مٹیں
دھویا بہت مٹتا نہیں تقدیر کا لکھا ہوا

✡

چرواہا بھیڑوں کو لے کر گھر گھر آیا رات ہوئی
تو پنچھی، دل تیرا پنجرہ، پنجرے میں جا رات ہوئی

کوئی ہمیں ہاتھوں پہ اٹھا کر بستر میں رکھ دیتا ہے
دنیا والے یہ کہتے ہیں سورج ڈوبا رات ہوئی

شہر مکاں، دکانوں والے سب پردے کرنوں نے لپیٹے
ختم ہوا سب کھیل تماشہ جا اب گھر جا رات ہوئی

سرخ سنہرا صافہ باندھے شہزادہ گھوڑے سے اُترا
کالے غار سے کمبل اوڑھے جوگی نکلا رات ہوئی

شام کے سائے زنداں کی دیواریں اونچی کرنے لگے
پھول سا دل لوہے کے پنجرے میں پھر آیا رات ہوئی

کس کی خاطر دھوپ کے گجرے ان شاخوں نے پہنے تھے
جنگل جنگل روئے میرا کوئی نہ آیا رات ہوئی

یہاں سورج ہنسیں گے آنسوؤں کو کون دیکھے گا
چمکتی دھوپ ہوگی، جگنوؤں کو کون دیکھے گا

پھلوں کی باغبانی میں تو بارش کی دُعا ہوگی
گزرتے خوب صورت بادلوں کو کون دیکھے گا

اگر ہم ساحلوں پر ڈور کانٹے لے کے بیٹھیں گے
تو موجوں کی چمکتی تتلیوں کو کون دیکھے گا

ہے سردی واقعی لیکن گھنے کہرے کی یورش میں
پہاڑوں سے اُترتی ان بسوں کو کون دیکھے گا

بہت اچھا سا کوئی سوٹ پہنو تنگدستی میں
اُجالوں میں چھپی ان بدلیوں کو کون دیکھے گا

ابھی اپنے اشاروں پر ہمیں چلنا نہیں آیا
سڑک کی لال پیلی بتّیوں کو کون دیکھے گا

☼

اِک سواری آئے گی اِک جائے گی
باری باری سب کی باری آئے گی

پھول اگر پیروں کے نیچے آئیں گے
آنکھوں کی بینائی کم ہوجائے گی

تھوڑی دیر میں اِک چراغوں کی تھالی
کالی بلی سر پر رکھ کر آئے گی

پت جھڑ کے پیلے سونے سے لدی
پکے بالوں والی اِک عورت آئے گی

سوکھے پھولوں سے سینے کو ڈھانپے گی
ٹوٹے پتّوں کی پشواز بنائے گی

آہستہ چلنے میں اب دم گھُٹتا ہے
ٹھہروں گا تو سانس میری رُک جائے گی

پانی کو گندہ کرنے سے کیا حاصل
تیری بھی پرچھائیں دُھندلا جائے گی

خود اپنے آپ سے شرمندگی سی ہوتی ہے
کبھی کبھی تو بڑی بے دِلی سی ہوتی ہے

سلگتی دُھوپ گھنی چاندنی سی ہوتی ہے
تمھارے ساتھ یہ دُنیا نئی سی ہوتی ہے

گلے میں اس کے خدا کی عجیب برکت ہے
وہ بولتا ہے تو اِک روشنی سی ہوتی ہے

وہ گنگناتا ہے، بیلے کے پھول کھلتے ہیں
تمام گھر میں بچھی چاندنی سی ہوتی ہے

کرن نکلنے سے پہلے گلاب دیکھے ہیں
تمھاری یاد میں وہ تازگی سی ہوتی ہے

وہ مسکراتی ہوئی دُھوپ جیسی آنکھوں میں
گھنیری پلکوں کے پیچھے نمی سی ہوتی ہے

مری غزل کسی پردہ نشیں کا قصّہ ہے
اگر سناؤں تو بے پردگی سی ہوتی ہے

میں بولتا ہوں تو الزام ہے بغاوت کا
میں چپ رہوں تو بڑی بے بسی سی ہوتی ہے

☼

اُداس رات ہے کوئی تو خواب دے جاؤ
مرے گلاس میں تھوڑی شراب دے جاؤ

بہت سے اور بھی گھر ہیں خدا کی بستی میں
فقیر کب سے کھڑا ہے جواب دے جاؤ

میں زرد پتّوں پہ شبنم سجا کے لایا ہوں
کسی نے مجھ سے کہا تھا حساب دے جاؤ

ادب نہیں ہے یہ اخبار کے تراشے ہیں
گئے زمانوں کی کوئی کتاب دے جاؤ

پھر اس کے بعد نظارے نظر کو ترسیں گے
وہ جا رہا ہے خزاں کے گلاب دے جاؤ

مری نظر میں رہے ڈوبنے کا منظر بھی
غروب ہوتا ہوا آفتاب دے جاؤ

ہزار صفحوں کا دیوان کون پڑھتا ہے
بشیر بدؔر کوئی انتخاب دے جاؤ

☼

اس کی چاہت کی چاندنی ہوگی
خوب صورت سی زندگی ہوگی

اِک لڑکی بہت سے پھول لیے
دل کی دہلیز پہ کھڑی ہوگی

چاہے جتنے چراغ گل کر دو
اس نگر میں تو روشنی ہوگی

نیند ترسے گی میری آنکھوں کو
جب بھی خوابوں سے دوستی ہوگی

ہم بہت دُور تھے مگر تم نے
دل کی آواز تو سنی ہوگی

سوچتا ہوں کہ وہ کہاں ہوگا
کس کے آنگن میں چاندنی ہوگی

☼

ساتھ چلتے جا رہے ہیں پاس آ سکتے نہیں
اِک ندی کے دو کناروں کو ملا سکتے نہیں

دینے والے نے دیا سب کچھ عجب انداز سے
سامنے دُنیا پڑی ہے اور اُٹھا سکتے نہیں

اس کی بھی مجبوریاں ہیں میری بھی مجبوریاں
روز ملتے ہیں مگر گھر میں بتا سکتے نہیں

کس نے کس کا نام اینٹوں پر لکھا ہے خون سے
اشتہاروں سے یہ دیواریں چھپا سکتے نہیں

راز جب سینے سے باہر ہو گیا اپنا کہاں
ریت پر بکھرے ہوئے آنسو اُٹھا سکتے نہیں

آدمی کیا ہے گزرتے وقت کی تصویر ہے
جانے والے کو صدا دے کر بلا سکتے نہیں

شہر میں رہتے ہوئے ہم کو زمانہ ہو گیا
کون رہتا ہے کہاں کچھ بھی بتا سکتے نہیں

اس کی یادوں سے مہکنے لگتا ہے سارا بدن
پیار کی خوشبو کو سینے میں چھپا سکتے نہیں

پتھروں کے برتنوں میں آنسوؤں کو کیا رکھیں
پھول کو لفظوں کے گملوں میں کھلا سکتے نہیں

☼

میرے ساتھ تم بھی دُعا کرو یوں کسی کے حق میں بُرا نہ ہو
کہیں اور ہو نہ یہ حادثہ ، کوئی راستے میں جدا نہ ہو

سرِ شام ٹھہری ہوئی زمیں جہاں آسماں ہے جھکا ہوا
اسی موڑ پر مرے واسطے وہ چراغ لے کے کھڑا نہ ہو

مری چھت سے رات کی سیج تک کوئی آنسوؤں کی لکیر ہے
ذرا بڑھ کے چاند سے پوچھنا وہ اسی طرف سے گیا نہ ہو

مجھے یوں لگا کہ خموش خوشبو کے ہونٹ تتلی نے چھو لیے
انھیں زرد پتّوں کی اوٹ میں کوئی پھول سویا ہوا نہ ہو

اسی احتیاط میں وہ رہا اسی احتیاط میں میں رہا
وہ کہاں کہاں مرے ساتھ ہے کسی اور کو یہ پتہ نہ ہو

وہ فرشتے آپ تلاش کریئے کہانیوں کی کتاب میں
جو بُرا کہیں نہ بُرا سنیں ، کوئی شخص ان سے خفا نہ ہو

وہ فراق ہو کہ وصال ہو تری آگ مہکے گی ایک دن
وہ گلاب بن کے کھلے گا کیا جو چراغ بن کے جلا نہ ہو

☼

خواب کی وادیوں سے نکلتا ہوا
چاند سوکر اُٹھا آنکھ ملتا ہوا

ہاتھ پر دُھوپ کی پتیاں رکھ گیا
کوئی پھولوں کی چادر بدلتا ہوا

شیش محلوں کے شیشوں سے ٹکرا گیا
پتھروں سے اُترتا سنبھلتا ہوا

شام تک ہوگا سورج ہماری طرح
کوئی سوکھا ہوا پیڑ جلتا ہوا

ایک آہٹ سی نزدیک آتی ہوئی
لان میں شام کا پھول کھلتا ہوا

میں بھی آہی گیا تیرے بازار تک
روز چہرے پہ چہرہ بدلتا ہوا

☼

شعر میرے کہاں تھے کسی کے لیے
میں نے سب کچھ لکھا ہے تمھارے لیے

اپنے دُکھ سکھ بہت خوبصورت رہے
ہم جئے بھی تو اِک دوسرے کے لیے

ہم سفر نے میرا ساتھ چھوڑا نہیں
اپنے آنسو دیے راستے کے لیے

اس حویلی میں اب کوئی رہتا نہیں
چاند نکلا کسے دیکھنے کے لیے

زندگی اور میں دو الگ تو نہیں
میں نے سب پھول کانٹے اسی سے لیے

شہر میں اب مرا کوئی دُشمن نہیں
سب کو اپنا لیا میں نے تیرے لیے

ذہن میں تتلیاں اُڑ رہی ہیں بہت
کوئی دھاگہ نہیں باندھنے کے لیے

ایک تصویر غزلوں میں ایسی بنی
اگلے پچھلے زمانوں کے چہرے لیے

☼

سیاہیوں کے بنے حرف حرف دھوتے ہیں
یہ لوگ رات میں کاغذ کہاں بھگوتے ہیں

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

چراغ پانی میں موجوں سے پوچھتے ہوں گے
وہ کون لوگ ہیں جو کشتیاں ڈبوتے ہیں

انھیں میں کھیلنے آتی ہیں بے ریا روحیں
وہ گھر جو لال، ہری بتّیوں کے ہوتے ہیں

قدیم قصبوں میں کیسا سکون ہوتا ہے
تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں

چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں سے زمیں
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

☼

دِکھلا کے یہی منظر بادل چلا جاتا ہے
پانی سے مکانوں پہ کیسے لکھا جاتا ہے

اس موڑ پہ ہم دونوں کچھ دیر بہت روئے
جس موڑ سے دنیا کو اِک راستہ جاتا ہے

دونوں سے چلو پوچھیں اس کو کہیں دیکھا ہے
اِک قافلہ آتا ہے اِک قافلہ جاتا ہے

اِک شمع جلاتے ہو اِک شمع بجھاتے ہو
یہ چاند اُبھرتا ہے دل ڈوبتا جاتا ہے

دنیا میں کہیں ان کی تعلیم نہیں ہوتی
دو چار کتابوں کو گھر میں پڑھا جاتا ہے

☼

میرے دل کی راکھ کرید مت اسے مسکرا کے ہوا نہ دے
یہ چراغ پھر بھی چراغ ہے کہیں تیرا ہاتھ جلا نہ دے

نئے دَور کے نئے خواب ہیں نئے موسموں کے گلاب ہیں
یہ محبتوں کے چراغ ہیں انھیں نفرتوں کی ہوا نہ دے

ذرا دیکھ چاند کی پتیوں نے بکھر بکھر کے تمام شب
ترا نام لکھّا ہے ریت پر کوئی لہر آ کے مٹا نہ دے

میں اُداسیاں نہ سجا سکوں کبھی جسم و جاں کے مزار پر
نہ دیے جلیں مری آنکھ میں مجھے اتنی سخت سزا نہ دے

مرے ساتھ چلنے کے شوق میں بڑی دُھوپ سر پہ اٹھائے گا
ترا ناک نقشہ ہے موم کا کہیں غم کی آگ گھلا نہ دے

میں غزل کی شبنمی آنکھ سے یہ دُکھوں کے پھول چنا کروں
مری سلطنت مرا فن رہے مجھے تاج و تخت خدا نہ دے

تلوار سے کاٹا ہے پھولوں بھری ڈالوں کو
دُنیا نے نہیں چاہا ہم چاہنے والوں کو

میں آگ تھا پھولوں میں تبدیل ہوا کیسے
بچوں کی طرح چوما اس نے مرے گالوں کو

اخلاق ، وفا چاہت سب قیمتی کپڑے ہیں
ہر روز نہ اوڑھا کر اُن ریشمی شالوں کو

برسات کا موسم تو لہرانے کا موسم ہے
اُڑنے دو ہواؤں میں بکھرے ہوئے بالوں کو

چڑیوں کے لیے چاول پودوں کے لیے پانی
تھوڑی سی محبت دے ہم چاہنے والوں کو

اب راکھ بٹوریں گے الفاظ کے سوداگر
میں آگ پہ رکھ دوں گا نایاب رسالوں کو

مولیٰ مجھے پانی دے، میں نے نہیں مانگا تھا
چاندی کی صراحی کو سونے کے پیالوں کو

☼

محبت سے عنایت سے وفا سے چوٹ لگتی ہے
بکھرتا پھول ہوں مجھ کو ہوا سے چوٹ لگتی ہے

مری آنکھوں میں آنسو کی طرح اِک رات آجاؤ
تکلف سے بناوٹ سے ادا سے چوٹ لگتی ہے

میں شبنم کی زباں سے پھول کی آواز سنتا ہوں
عجب احساس ہے اپنی صدا سے چوٹ لگتی ہے

تجھے خود اپنی مجبوری کا اندازہ نہیں شاید
نہ کر عہدِ وفا ، عہدِ وفا سے چوٹ لگتی ہے

☼

پاس سے دیکھو جگنو آنسو ، دور سے دیکھو تارا آنسو
میں پھولوں کی سیج پہ بیٹھا آدھی رات کا تنہا آنسو

موسم کی خوشبو میں اکثر غم کی خوشبو مل جاتی ہے
آموں کے باغوں میں کیسے ساون ساون برسا آنسو

اپنے بچپن کا قصہ ہے اِک تصویر بنائی اس نے
مہندی والے ہاتھ رَچے تھے بیچ ہتھیلی ٹپکا آنسو

اِک گاؤں میں دو باراتیں شاید دولہا بدل گیا ہے
میری آنکھ میں تیرا آنسو تیری آنکھ میں میرا آنسو

میری آنکھوں نے اکثر غم کے دونوں پہلو دیکھے
ٹھہر گیا تو پتھر آنسو ، بہہ نکلا تو دریا آنسو

پیار عجیب تلوار ہے جس پہ ہم دونوں کے نام لکھے ہیں
ٹہنی ٹہنی کلیاں آنسو ، پتھر پتھر جھرنا آنسو

سبھی سے ان دونوں روٹھا ہوا سا لگتا ہوں
میں اپنے آپ کو اب بے وفا سا لگتا ہوں

تمام رات میں گرتی ہوئی حویلی میں
دِلوں سے نکلی ہوئی بدُعا سا لگتا ہوں

میں وہ خزانہ ہوں حقدار جس کی دنیا ہے
ہزار حصوں میں بانٹا ہوا سا لگتا ہوں

مری تلاش بدستور اب بھی جاری ہے
وہ مل گیا ہے میں کھویا ہوا سا لگتا ہوں

مری ہنسی سے اُداسی کے پھول کھلتے ہیں
میں سب کے ساتھ ہوں لیکن جدا سا لگتا ہوں

چمک رہا تھا وہ چہرہ کسی کی آنکھوں میں
میں آئینے میں کوئی دوسرا سا لگتا ہوں

تمام رات برستی ہے ریت پر شبنم
میں اپنے چاند سے جب بھی خفا سا لگتا ہوں

☼

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں

کسی نے جس طرح اپنے ستاروں کو سجایا ہے
غزل کے ریشمی دھاگوں میں یوں موتی پروتے ہیں

پرانے موسموں کے نام نامی مٹتے جاتے ہیں
کہیں پانی کہیں شبنم ، کہیں آنسو سے دھوتے ہیں

یہی انداز ہے میرا سمندر فتح کرنے کا
مری کاغذ کی کشتی میں کئی جگنو بھی ہوتے ہیں

سنا ہے بدؔر صاحب محفلوں کی جان ہوتے تھے
بہت دن سے وہ پتھر ہیں نہ ہنستے ہیں نہ روتے ہیں

☼

دل میں اِک تصویر چھپی تھی آن بسی ہے آنکھوں میں
شاید ہم نے آج غزل سی بات لکھی ہے آنکھوں میں

جیسے ایک ہریجن لڑکی مندر کے دروازے پر
شام دِیوں کی تھال سجائے جھانک رہی ہے آنکھوں میں

اس رومال کو کام میں لاؤ اپنی پلکیں صاف کرو
میلا میلا چاند نہیں ہے دھول جمی ہے آنکھوں میں

پڑھتا جا یہ منظرنامہ زرد عظیم پہاڑوں کا
دُھوپ کھلی پلکوں کے اوپر برف جمی ہے آنکھوں میں

میں نے اِک ناول لکھا ہے آنے والی صبح کے نام
کتنی راتوں کا جاگا ہوں نیند بھری ہے آنکھوں میں

☼

سب کچھ خاک ہوا ہے لیکن چہرہ کیا نورانی ہے
پتھر نیچے بیٹھ گیا ہے اوپر بہتا پانی ہے

بچپن سے میری عادت ہے پھول چھپا کر رکھتا ہوں
ہاتھوں پر جلتا سورج ہے دل میں رات کی رانی ہے

دفن ہوئے راتوں کے قصّے اِک چھت کی خاموشی میں
سنّاٹوں کی چادر اوڑھے یہ دیوار پرانی ہے

اس کو پاکر اِتراؤ گے کھوکر جان گنوادوں گے
بادل کا سایہ ہے دُنیا ہر شئے آنی جانی ہے

دل اپنا اِک چاند نگر ہے اچھی صورت والوں کا
شہر میں آکر شاید ہم کو یہ جاگیر گنوانی ہے

تیرے بدن پر میں پھولوں سے اس لمحہ کا نام لکھوں
جس لمحہ کا میں افسانہ تو بھی اِک کہانی ہے

✡

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہوا
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو ، تجھے اپنا کوئی پتہ نہ ہو

کبھی دُھوپ دے کبھی بدلیاں دل و جاں سے دونوں قبول ہیں
مگر اس محل میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو

وہ ہزار باغوں کا باغ ہو تری برکتوں کی بہار سے
جہاں کوئی شاخ ہری نہ ہو جہاں کوئی پھول کھلا نہ ہو

ترے اختیار میں کیا نہیں مجھے اس طرح سے نواز دے
یوں دُعائیں میری قبول ہوں مرے لب پہ کوئی دُعا نہ ہو

کبھی ہم بھی اس کے قریب تھے دل و جاں سے بڑھ کر عزیز تھے
مگر آج ایسے ملا ہے وہ کبھی پہلے جیسے ملا نہ ہو

☼

کچھ تو پاس بچا کر رکھو ، سب کچھ کاروبار نہ جانو
دل کے دروازے مت کھولو اس گھر کو بازار نہ جانو

مانا رستہ بہت کٹھن ہے پھر بھی سایہ دار شجر ہیں
ٹہنی کو تلوار نہ سمجھو آنچل کو دیوار نہ جانو

سب کچھ اُس کو دے آیا ہوں سب کچھ اس سے لے آیا ہوں
مری جیت کو جیت نہ سمجھو میری ہار کو ہار نہ جانو

دن بھر دُھوپ میں چلتے چلتے ہم دونوں کی شام ہوئی
تھک کر بانہوں میں سو جانا یہ جسمانی پیار نہ جانو

تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر غزل ہے
لفظوں کی مینا کاری کو الہامی اشعار نہ جانو

آسمان

حمد و نعت

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے
جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

مجھے اپنے چادر میں یوں ڈھانپ لو
زمیں آسماں کچھ دکھائی نہ دے

میں اشکوں سے نامِ محمدؐ لکھوں
قلم چھین لے ، روشنائی نہ دے

غلامی کو برکت سمجھنے لگیں
اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دِکھائی نہ دے

☼

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

تمام رشتوں کو میں گھر پہ چھوڑ آیا تھا
پھر اس کے بعد مجھے کوئی اجنبی نہ ملا

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں، میں نے
بس ایک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا

بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دُوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

☼

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں
اور جام ٹوٹیں گے اس شراب خانے میں
موسموں کے آنے میں موسموں کے جانے میں
ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دِل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں
فاختہ کی مجبوری یہ بھی کہہ نہیں سکتی
کون سانپ رکھتا ہے اس کے آشیانے میں
دوسری کوئی لڑکی زندگی میں آئے گی
کتنی دیر لگتی ہے اس کو بھول جانے میں

☼

ہمارے ہاتھوں میں اِک شکل چاند جیسی تھی
تمھیں یہ کیسے بتائیں وہ رات کیسی تھی
مہک رہے تھے مرے ہونٹ اس کی خوشبو سے
عجیب آگ تھی بالکل گلاب جیسی تھی
اسی میں سب تھے مری ماں، بہن بھی، بیوی بھی
سمجھ رہا تھا جسے میں وہ ایسی ویسی تھی
تمھارے گھر کے سبھی راستوں کو کاٹ گئی
ہمارے ہاتھ میں کوئی لکیر ایسی تھی

☼

میں خزاں کی دُھوپ کا آئینہ کہ میں ایک ہو کے ہزار ہوں
کہیں آنسوؤں کا ہوں قافلہ کہیں جگنوؤں کی قطار ہوں

کوئی تارہ ٹوٹ کے گر گیا کوئی چاند چھت سے اُتر گیا
کسی آسمان کی چال سے جو بکھر گیا وہی ہار ہوں

وہی سوکھے سے پیڑ ہیں وہی اُجڑی اُجڑی سی ٹہنیاں
کوئی پھول جس پہ کھلا نہیں میں غموں کی ایسی بہار ہوں

مجھے کیوں بلاتے ہیں پیار سے یہ چہکتے پنچھی منڈیر کے
میں خموشی کا درد ہوں میں اُداس چاند کا پیار ہوں

میں وہ شعر ہوں جسے آج تک نہ کہا گیا نہ سنا گیا
جسے اُنگلیوں نے چھوا نہیں وہی بدنصیب ستار ہوں

ہر اِک چراغ کی لَو ایسی سوئی سوئی تھی
وہ شام جیسے کسی سے بچھڑ کے روئی تھی

نہا گیا تھا میں کل جگنوؤں کی بارش میں
وہ میرے کاندھے پہ سر رکھ کے خوب روئی تھی

قدم قدم پہ لہو کے نشان کیسے ہیں
یہ سرزمیں تو مرے آنسوؤں نے دھوئی تھی

مکان کے ساتھ وہ پودا بھی جل گیا جس میں
مہکتے پھول تھے پھولوں میں ایک تتلی تھی

خود اس کے باپ نے پہچان کر نہ پہچانا
وہ لڑکی پچھلے فسادات میں جو کھوئی تھی

☼

دل کی دہلیز پہ یادوں کے دیے رکھے ہیں
آج تک ہم نے یہ دروازے کھلے رکھے ہیں

اس کہانی کے وہ کردار کہاں سے لاؤں
وہی دریا ہے وہی کچے گھڑے رکھے ہیں

ہم پہ جو گزری نہ بتایا نہ بتائیں گے کبھی
کتنے خط اب بھی ترے لکھے ہوئے رکھے ہیں

آپ کے پاس خریداری کی قوت ہے اگر
آج سب لوگ دُکانوں میں سجے رکھے ہیں

☼

ٹوٹے ہوئے ستار کے سب تار کس گئے
بارش ہوئی کہ درد کے نغمے برس گئے

کیسی سیاہ رات تھی دہلیز پر کھڑی
وہ مسکرا دیے تو اُجالے برس گئے

شادابیوں کے دَور کا انجام یہ ہوا
اب کے تو بوند بوند کو دریا ترس گئے

اب خاک اُڑ رہی ہے گلابوں کے شہر میں
وہ لُو چلی ہے اب کے کہ پتھر جھلس گئے

گھر سے خلوص کیا گیا سب کچھ چلا گیا
باتوں میں رس نہیں رہا ہاتھوں کے جس گئے

عام میں انتخاب تھے کچھ لوگ شہر میں
کوئی تو کچھ بتائے کہاں جا کے بس گئے

☼

اگر یقیں نہیں آتا تو آزمائے مجھے
وہ آئینہ ہے تو پھر آئینہ دِکھائے مجھے

عجب چراغ ہوں دن رات جلتا رہتا ہوں
میں تھک گیا ہوں ہوا سے کہو بجھائے مجھے

میں جس کی آنکھ کا آنسو تھا اس نے قدر نہ کی
بکھر گیا ہوں تو اب ریت سے اُٹھائے مجھے

بہت دِنوں سے میں ان پتھروں میں پتھر ہوں
کوئی تو آئے ذرا دیر کو رُلائے مجھے

میں چاہتا ہوں کہ تم ہی مجھے اجازت دو
تمھاری طرح سے کوئی گلے لگائے مجھے

☼

کوئی حل نہ کوئی جواب ہے یہ سوال کیسا سوال ہے
جسے بھول جانے کا حکم ہے اسے بھول جانا محال ہے

ہوئیں زرد پھولوں کی بستیاں مگر اس میں تیری خطا کہاں
تجھے لوگ دل سے دُعائیں دیں یہی تیرے فن کا کمال ہے

کبھی آسماں کی بلندیوں سے اُتر کے خاک پہ آئیں گے
ابھی پنچھیوں کو خبر نہیں یہ زمین دانوں کا جال ہے

اسی سبز پیڑ کی اوٹ میں ابھی چاند ہار کے سو گیا
تیرے پاک ہونٹوں کو چوم لے یہ کہاں کسی کی مجال ہے

اسی ایک بسترِ بے حسی پہ تھکے تھکے سے بدن ملے
ترے ساتھ بھی وہی بے دلی یہ وصال کیسا وصال ہے

☼

وہ گنہگار مرے حق میں دُعا کر دیتا
میرے سوکھے ہوئے جنگل کو ہرا کر دیتا

کاش وہ آتا مرے ماتھے کے بوسے لیتا
میں ہوں بیمار مرے حق میں دُعا کر دیتا

یوں بھی تبدیل بہاروں میں خزاں ہو جاتی
اپنے دامن سے وہ چہرے پہ ہوا کر دیتا

یہ جو بے عیب ہیں تا عمر ترستے رہتے
مجھ کو ایسی کوئی تا عمر سزا کر دیتا

منہ چھپا لیتا، یہ سورج بھی کسی دامن میں
ایسے لہرا کے وہ زلفوں کی گھٹا کر دیتا

یہ کوئی غم ہے کہ آسائشِ دنیا کم ہے
بے نیازی میں مجھے حد سے سوا کر دیتا

ایک مدت سے یہ ہمراہ رہا کرتی ہیں
رنجشیں کوئی مرے دل سے جدا کر دیتا ہے

☼

دُلہن بنی ہے رات بڑے اہتمام سے
آنسو سجا رہی ہے ستاروں کے نام سے

سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے
نیند آ گئی ہے آج ستاروں کو شام سے

ان سے ضرور ملنا سلیقے کے لوگ ہیں
سر بھی قلم کریں گے بڑے احترام سے

کتنا بدل گیا ہوں میں دُنیا کے واسطے
آواز دے رہی ہے مجھے تیرے نام سے

☼

وہ انتظار کی چوکھٹ پہ سو گیا ہوگا
کسی سے وقت تو پوچھیں کہ کیا بجا ہوگا

میں ہنس رہا ہوں لطیفوں کی شعری محفل میں
وہ میری آنکھوں سے اس وقت رو رہا ہوگا

یہ پتھروں کی طرح کیوں اُداس رہتا ہے
مجھے یقین ہے دل اس کا آئینہ ہوگا

میں اس خیال سے اس کے قریب آیا تھا
کہ دوسروں کی طرح وہ بھی بے وفا ہوگا

وہ بجھے گھروں کا چراغ تھا یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو
اسے لے گئی ہے کہاں ہوا ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کئی لوگ جان سے جائیں گے مرے قاتلوں کی تلاش میں
مرے قتل میں مرا ہاتھ تھا ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ تمام دنیا کے واسطے جو محبتوں کی مثال تھا
وہی اپنے گھر میں تھا بے وفا ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کہیں مسجدوں میں شہادتیں، کہیں مندروں میں عدالتیں
یہاں کون کرتا ہے فیصلہ یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مرے پاس جتنی ہے روشنی ہے یہی چراغ کی زندگی
میں کہاں جلا ، میں کہا بجھا ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مجھے جان کر کوئی اجنبی وہ دِکھا رہے ہیں گلی گلی
اسی شہر میں مرا گھر بھی تھا ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ سمجھ کے دُھوپ کے دیوتا مجھے آج پوجنے آئے ہیں
میں چراغ ہوں تری شام کا ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کون آیا راستے آئینہ خانے ہو گئے
رات روشن ہو گئی دن بھی سہانے ہو گئے

کیوں حویلی کے اُجڑنے کا مجھے افسوس ہو
سینکڑوں بے گھر پرندوں کے ٹھکانے ہو گئے

جاؤ ان کمروں کے آئینے اٹھا کر پھینک دو
بے ادب یہ کہہ رہے ہیں ہم پرانے ہو گئے

یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے اس کو پہچانا نہ ہو
اب اسے دیکھے ہوئے کتنے زمانے ہو گئے

میری پلکوں پر یہ آنسو پیار کی توہین تھے
اس کی آنکھوں سے گرے موتی کے دانے ہو گئے

☼

عظمتیں سب تری خدائی کی
حیثیت کیا مری اِکائی کی

مرے ہونٹوں کے پھول سوکھ گئے
تم نے کیا مجھ سے بے وفائی کی

سب مرے ہاتھ پاؤں لفظوں کے
اور آنکھیں بھی روشنائی کی

میں ہی ملزم ہوں، میں ہی منصف ہوں
کوئی صورت نہیں رِہائی کی

اِک برس زندگی کا بیت گیا
تہہ جمی ایک اور کائی کی

اب ترستے رہو غزل کے لیے
تم نے لفظوں سے بے وفائی کی

☼

خاندانی رشتوں میں اکثر رقابت ہے بہت
گھر سے نکلو تو یہ دنیا خوبصورت ہے بہت

اپنے کالج میں بہت مغرور جو مشہور ہے
دل مرا کہتا ہے اس لڑکی میں چاہت ہے بہت

ان کے چہرے چاند تاروں کی طرح روشن رہے
جن غریبوں کے یہاں حسنِ عناعت ہے بہت

ہم سے ہوسکتی نہیں دنیا کی دنیاداریاں
عشق کی دیوار کے سائے میں راحت ہے بہت

دُھوپ کی چادر مرے سورج سے کہنا بھیج دے
غربتوں کا دَور ہے جاڑوں کی شدت ہے بہت

ان اندھیروں میں جہاں سہمی ہوئی تھی یہ زمیں
رات سے تنہا لڑا جگنو میں ہمّت ہے بہت

☼

تیر نظروں کے تو پلکوں کی کماں رکھے ہیں
ان کی کیا بات ہے پھولوں کی زباں رکھے ہیں

ہم تو آنکھوں میں سنورتے ہیں وہیں سنوریں گے
ہم نہیں جانتے آئینے کہاں رکھے ہیں

اپنے قاتل بھی اسی روز سے شرمندہ ہیں
ہم بھی خاموش بہت اپنی زباں رکھے ہیں

دل کبھی ریت کا ساحل نہیں ہونے دیتے
ہم نے محفوظ وہ قدموں کے نشاں رکھے ہیں

جن پہ تحریر ہے بچپن کی محبت اپنی
اب مرے گھر کے وہ دروازے کہاں رکھے ہیں

☼

یہ زمین سوئی تھی نیند میں یہاں لا کے مجھ کو بسا گئے
وہ چمکتی دُھوپ کی شال پر مرے دل کے پھول سجا گئے

کسی رات برف کی اوٹ سے نئی آگ لے کے وہ آئیں گے
اگر آج دُھوپ کی گود میں وہ گلاب اپنے سلا گئے

کوئی لوگ آگ کے پھول ہیں ذرا دور ہوں تو چمن چمن
جہاں مسکرا کے گلے لگے دل و جاں میں آگ لگا گئے

یہ ہنسی بھی کوئی نقاب ہے جہاں چاہا ہم نے گرا لیا
کبھی اس کا درد چھپا گئے کبھی اپنا درد چھپا گئے

وہاں سات چولھے انگیٹھیاں ، بجھے مرد عورتیں بچیاں
جہاں شام آئی تو سات گھر اسی ایک گھر میں سما گئے

مرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں تو اندھیری رات کی شمعیں ہیں
یہ بدن تمام ہے موم کا وہ اسی لیے تو جلا گئے

کئی راج محلوں کے راجگاں لیے ساتھ میووں کی برفیاں
کبھی آج تک جو بنی نہیں اسی مورتی پہ چڑھا گئے

ابھی رات پھولوں کی کار میں یہاں ایک آئے تھے پیر جی
ہمیں بعدِ مرگ ملے گا کیا وہ تمام نقش دکھا گئے

☼

کئی پیڑ دُھوپ کے پیڑ تھے تری رحمتوں سے ہرے رہے
مرے نام آگ کے پھول تھے مرے جھولیوں میں بھرے رہے

کہیں مال وزر کے وزیر تھے کہیں علم وفن کے امیر تھے
ولے ہم بھی ایسے فقیر تھے جو ہمیشہ ان سے پَرے رہے

مرے دل میں درد کے پیڑ ہیں یہاں کوئی خوفِ خزاں نہیں
یہ درخت کتنے عجیب تھے سبھی موسموں میں ہرے رہے

وہ کلام جن سے چھتیں اُڑیں وہیں شامیانوں میں دفن ہیں
ترے شعر دل میں اُتر گئے جو کھرے تھے سکّے کھرے رہے

☼

میں کب تنہا ہوا تھا، یاد ہوگا
تمھارا فیصلہ تھا، یاد ہوگا

بہت سے اُجلے اُجلے پھول لے کر
کوئی تم سے ملا تھا یاد ہوگا

بچھی تھی ہر طرف آنکھیں ہی آنکھیں
کوئی آنسو گرا تھا، یاد ہوگا

اُداسی اور بڑھتی جا رہی تھی
وہ چہرہ بجھ رہا تھا، یاد ہوگا

وہ خط پاگل ہوا کے آنچلوں پر
کسے تم نے لکھا تھا، یاد ہوگا

مری زباں پہ نئے ذائقوں کے پھل لکھ دے
مرے خدا تو مرے نام اِک غزل لکھ دے

میں چاہتا ہوں یہ دنیا وہ چاہتا ہے مجھے
یہ مسئلہ بڑا نازک ہے کوئی حل لکھ دے

یہ آج جس کا ہے اُس نام کو مبارک ہو
مری جبیں پہ مرے آنسوؤں سے کل لکھ دے

ہوا کی طرح میں بیتاب ہوں کہ شاخِ گلاب
جو ریگزاروں پہ تالاب کے کنول لکھ دے

میں ایک لمحے میں دنیا سمیٹ سکتا ہوں
تو کب ملے گا اکیلے میں ایک پل لکھ دے

☼

دروازے کی راکھ بھی گھر ہے مٹھی میں یہ گھر رکھنا
دل اِک پاکیزہ چادر ہے سر پر یہ چادر رکھنا

جلی ہوئی ٹوٹی دیواریں میرے زخمی کاندھے ہیں
چاندنی رات میں چھپ کر آنا اِن پر اپنا سر رکھنا

جس کاغذ پر حال لکھوں گا وہ کاغذ جل جائے گا
تتلی پر تیزاب چھڑکنا پھولوں پر خنجر رکھنا

صندل اور سیندور سے مانگ سدا رہے تاروں کی لڑی
رہے کلائی یونہی کھنکتی ، مالک یہ زیور رکھنا

اس دھرتی سے پیار کیا تھا، پیار کیا ہے پیار کروں گا
میں جب جاؤں مرے تن پر ماٹی کی چادر رکھنا

☼

اپنی کھوئی ہوئی جنتیں پا گئے زیست کے راستے بھولتے بھولتے
موت کی وادیوں میں کہیں کھو گئے تیری آواز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے

مست و سرشار تھے کوئی ٹھوکر لگی آسماں سے زمیں پر یوں ہم آ گئے
شاخ سے پھول جیسے کوئی گر پڑے رقص آواز پر جھومتے جھومتے

کوئی پتھر نہیں ہوں کہ جس شکل میں مجھ کو چاہو بنایا بگاڑا کرو
بھول جانے کی کوشش تو کی تھی مگر یاد تم آ گئے بھولتے بھولتے

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آ گئی ، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اب وہ گیسو نہیں ہیں جو سایہ کریں اب وہ شانے نہیں جو سہارا بنیں
موت کے بازوؤ تم ہی آگے بڑھو تھک گئے آج ہم گھومتے گھومتے

دل میں جو تیر ہیں اپنے ہی تیر ہیں ، اپنی زنجیر سے پا بہ زنجیر ہیں
سنگریزوں کو ہم نے خدا کر دیا ، آخرش ، رات دن پوجتے پوجتے

میں تم کو بھول بھی سکتا ہوں اس جہاں کے لیے
ذرا سا جھوٹ ضروری ہے داستاں کے لیے

میرے لبوں پہ کوئی بوند ٹپکی آنسو کی
یہ قطرہ کافی تھا جلتے ہوئے مکاں کے لیے

میں کیا دکھاؤں مرے تار تار دامن میں
نہ کچھ یہاں کے لیے ہے نہ کچھ وہاں کے لیے

غزل بھی اس طرح اس کے حضور لایا ہوں
کہ جیسے بچہ کوئی آئے امتحاں کے لیے

☼

بے خبر کرسیاں آنکھ ملتی رہیں
بستیاں بے گناہوں کی جلتی رہیں

آدمیت ، محبت ، شرافت ، وفا
ناگنیں آستینوں میں پلتی رہیں

دو بدن جتنے نزدیک ہوتے گئے
قربتیں فاصلوں میں بدلتی رہیں

جب مری زندگی میں اندھیرا ہوا
میرے چاروں طرف شمعیں جلتی رہیں

زہر پانی بنا مچھلیوں کے لیے
پنچھیوں کو ہوائیں مسلتی رہیں

زندگی تیری نازک بدن لڑکیاں
آگ کی شاہراہوں پہ چلتی رہیں

☼

مسکراتے رہے غم چھپاتے رہے ، محفلوں محفلوں گنگناتے رہے
موت کے تیرہ و تار شمشان میں ، زندگی کے کنول جگمگاتے رہے

غزلیں کمھلا گئیں، نظمیں مرجھا گئیں، گیت سنولا گئے، ساز چپ ہو گئے
پھر بھی اہلِ چمن کتنے خوش طبع تھے ، نغمۂ فصلِ گل گنگناتے رہے

تیری سانسوں کی خوشبو، لبوں کی مہک جانے کیسے ہوائیں اُڑا لائی تھیں
رات کا ہر قدم کچھ بہکتا رہا ، وقت کے پاؤں بھی ڈگمگاتے رہے

جیسے کشمیری جھیلوں کی آغوش میں ننھے ننھے ستارے اُتر آئے ہوں
رات ان نیلی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی آنسوؤں کے دیے جھلملاتے رہے

شاہدِ زندگی تو نے بھولے سے بھی ہم غریبوں کی جانب نہ دیکھا کبھی
اور ہم تو تری عظمتوں کے لیے سر کٹاتے رہے جاں گنواتے رہے

تیرے لب کی مہک میرے بازو کا بَل تیری آنکھوں کا رس میرے ہاتھوں کا جَس
سالہا سال سے جنسِ بازار ہیں صاحبِ نقد بولی لگاتے رہے

رات موسم بہت فتنہ انگیز تھا ، اس پہ یادوں کی زلفیں بھی لہرا گئیں
دیر تک دل سے تیری ہی باتیں رہیں بھولی بسری کہانی سناتے رہے

☼

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہو جائے گا

ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑیں گے راستہ ہو جائے گا

کتنی سچائی سے مجھ سے زندگی نے کہہ دیا
تو نہیں میرا تو کوئی دوسرا ہو جائے گا

میں خدا کا نام لے کر پی رہا ہوں دوستو
زہر بھی اس میں اگر ہوگا، دوا ہو جائے گا

سب اُسی کے ہیں ہوا، خوشبو، زمین و آسماں
میں جہاں بھی جاؤں گا اس کو پتہ ہو جائے گا

☼

غزلوں کا ہنر اپنی آنکھوں کو سکھائیں گے
روئیں گے بہت لیکن آنسو نہیں آئیں گے

کہہ دینا سمندر سے ہم اوس کے موتی ہیں
دریا کی طرح تجھ سے ملنے نہیں آئیں گے

وہ دھوپ کے چھپّر ہوں یا چھاؤں کی دیواریں
اب جو بھی اُٹھائیں مل جل کے اُٹھائیں گے

جب ساتھ نہ دے کوئی آواز ہمیں دینا
ہم پھول سہی لیکن پتھر بھی اُٹھائیں گے

☼

چاند کے چاروں طرف میلی ردائیں ساتھ ہیں
خاک اتنی سَر چڑھے کس کی ہوائیں ساتھ ہیں

ایک عورت سے وفا کرنے کا یہ تحفہ ملا
جانے کتنی عورتوں کی بددُعائیں ساتھ ہیں

انگلیاں میری ستاروں تک پہنچ سکتی نہیں
مٹّھیوں میں جگنوؤں کی بد دُعائیں ساتھ ہیں

دل کھلا ہے پھول سا اور رات بھیگی آنکھ سی
کوئی موسم ہو یہاں دونوں ہوائیں ساتھ ہیں

میں ہوں اِک کاغذ کا ٹکڑا جانے کس کی کھوج میں
کیوں مرے پیچھے زمانے کی ہوائیں ساتھ ہیں

☼

میں اُداس رستہ ہوں شام کا تری آہٹوں کی تلاش ہے
یہ ستارے سب ہیں بجھے بجھے مجھے جگنوؤں کی تلاش ہے

ذرا سیر کرنے کو آئے ہیں ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے
وہ ہیں ڈور کانٹے لیے ہوئے جنھیں مچھلیوں کی تلاش ہے

وہ جو ایک دریا تھا آگ کا سبھی راستوں سے گزر گیا
تمھیں کب سے ریت کے شہر میں نئی بارشوں کی تلاش ہے

نئے موسموں کی اُڑان کو ابھی اس کی کوئی خبر نہیں
ترے آسمان کے جال کو نئے پنچھیوں کی تلاش ہے

مرے دوستوں نے سکھا دیا مجھے اپنی جان سے کھیلنا
مری زندگی تجھے کیا خبر مجھے قاتلوں کی تلاش ہے

تری میری ایک ہیں منزلیں وہی جستجو وہی آرزو
تجھے دوستوں کی تلاش ہے مجھے دُشمنوں کی تلاش ہے

☼

میں غزل کہوں میں غزل پڑھوں مجھے دے تو حسنِ خیال دے
ترا غم ہی ہے مری تربیت، مجھے دے تو رنج و ملال دے

سبھی چار دن کی ہیں چاندنی یہ ریاستیں یہ وزارتیں
مجھے اس فقیر کی شان دے کہ زمانہ جس کی مثال دے

مری صبح تیرے سلام سے مری شام ہے تیرے نام سے
ترے دَر کو چھوڑ کے جاؤں گا یہ خیال دل سے نکال دے

مرے سامنے جو پہاڑ تھے سبھی سر جھکا کے چلے گئے
جسے چاہے تو یہ عروج دے جسے چاہے تو یہ زوال دے

بڑے شوق سے انھیں پتھروں کو شکم سے باندھ کے سو رہوں
مجھے مالِ مفت حرام ہے مجھے دے تو رزقِ حلال دے

ادب کی حد میں ہوں میں بے ادب نہیں ہوتا
تمھارا تذکرہ اب روز و شب نہیں ہوتا

کبھی کبھی تو چھلک پڑتی ہیں یوں ہی آنکھیں
اُداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا

کئی امیروں کی محرومیاں نہ پوچھ کہ بس
غریب ہونے کا احساس اب نہیں ہوتا

میں والدین کو یہ بات کیسے سمجھاؤں
محبتوں میں حسب و نسب نہیں ہوتا

وہاں کے لوگ بڑے دلفریب ہوتے ہیں
مرا بہکنا بھی کوئی عجب نہیں ہوتا

میں اس زمین کا دیدار کرنا چاہتا ہوں
جہاں کبھی بھی خدا کا غضب نہیں ہوتا

☼

ایسا نغمہ ہیں جس میں صدا تک نہیں، ایسی آندھی ہیں جس میں ہوا تک نہیں
زندگی کی طرح جاوداں بیکراں ، اتنے مجبور جتنی فضا تک نہیں

چلتے مضمونوں کے نوٹس اور ترجمے، اُجلے شوکیس میں سج گئے ٹھیک ہے
کیوں دُکان دار رکھے کتابِ ادب، جب اسے اب کوئی پوچھتا تک نہیں

اِک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موجِ واں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں، ٹین کے نوجواں، مختلف رنگ میں
دوست ہیں، دوستی سے مگر بے خبر، دشمنِ جاں ہیں لیکن خفا تک نہیں

زعفراں رنگ کے گیسوؤں کی گھٹا آسماں رنگ کے کوٹ پر چھا گئی
نرم یادوں کے اُجلے فرشتوں کے پر، دودھیا خاموشی اور ہوا تک نہیں

☼

روشنی کے مقدر میں نیندیں کہاں چاند میں، طاقت پر وہ سجائیں کہیں
ہم چراغِ وفا، جلنا ہے رات بھر آسماں تا زمیں وہ جلائیں کہیں

دو بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے ملیں یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

شہرتیں مثلِ مینارِ عظمت ہمیں آسماں کی طرف لے چلی ہیں مگر
جی میں ہے سبز پیغمبروں کی طرح سینۂ سنگ سے سر اُٹھائیں کہیں

برف سی اُجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہیں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

کوئی کتبہ نہیں ہیں سرِ راہ ہم جس پہ اقوالِ زرّیں بدلتے رہو
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھ لو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں

اَن کہے شعر ہیں وادیٔ ذہن میں، مختلف رنگ کے جھلملاتے دیے
دستِ الفاظ محفوظ کر لے انھیں، چل رہی ہے ہوا بجھ نہ جائیں کہیں

☼

تیرا ہاتھ مرے کاندھے پر دریا بہتا جاتا ہے
کتنی خاموشی سے دُکھ کا موسم گزرا جاتا ہے

نیم پہ اٹکے چاند کی پلکیں شبنم سے بھر جاتی ہیں
سونے گھر میں رات گئے جب کوئی آتا جاتا ہے

پہلے اینٹیں، پھر دروازے اب کے چھت کی باری ہے
یاد نگر میں ایک محل تھا وہ بھی گرتا جاتا ہے

راکھ ہوئیں آنکھوں کی شمعیں آنسو بھی بے نور ہوئے
دھیرے دھیرے میرا دل پتھر سا ہوتا جاتا ہے

اپنا دل ہے ایک پرندہ جس کے بازو ٹوٹے ہیں
حسرت سے بادل کو دیکھے بادل اُڑتا جاتا ہے

ساری رات برسنے والی بارش کا میں آنچل ہوں
دن میں کانٹوں پر پھیلا کر مجھ کو سکھایا جاتا ہے

ہم نے تو بازار میں دنیا بیچی اور خریدی ہے
ہم کو کیا معلوم کسی کو کیسے چاہا جاتا ہے

☼

میری یادوں کی اِک اِک گلی سوگئی، میرے خوابوں کے سارے مکاں سوگئے
دل شبِ تار کی سلطنت ہوگیا جب سے اشکوں کے شہزادگاں سوگئے

پتھروں کی زمیں پتھروں کے شجر، پتھروں کے مکاں، پتھروں کے بشر
کب سویرا ہوا ہم کدھر کو چلے کس گلی شام آئی، کہاں سوگئے

کیا ہوا، آج کیوں خیمۂ زخم سے، کج کلاہانِ غم پھر نکلنے لگے
ہم تو سمجھے تھے اب شہرِ دل مٹ چکا تھک گئے درد کے کارواں سوگئے

اس کی آمد پہ دل کی تمنّاؤں نے روشنی کے گھروندے بنائے بہت
ایک وہ کیا گیا سب دیے بجھ گئے، آرزوؤں کے سارے مکاں سوگئے

☼

اُڑتے بادل، بزرگوں کی شفقت بنے دُھوپ میں لڑکیاں مسکراتی رہیں
جب سے جانا کہ اب کوئی منزل نہیں، منزلیں راہ میں آتی جاتی رہیں

رات، پریاں، فرشتے ہمارے بدن، مانگ کر برف میں جل رہے تھے مگر
کچھ شبیہیں، کتابوں کے بجھتے دیے، کاغذی مقبروں میں جلاتی رہیں

سارے دن کی تپی ساحلی ریت پر دو تڑپتی ہوئی مچھلیاں سوگئیں
اپنے ملنے کی وہ آخری شام تھی لہریں آتی رہیں لہریں جاتی رہیں

ننگے پاؤں فرشتوں کا اِک طائفہ، آسماں سے زمیں پر اُترنے لگا
سربرہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

اِک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر رات کے راستوں کی طرح کھوگیا
نرم مٹی پہ گرتی ہوئی پتیاں سونے والوں کو چادر اُڑھاتی رہیں

☼

مرے سینے پر وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا روتا رہا

شبنمی سی دُھوپ میں جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اُترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اِک دل پہ رکھا ہے جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی ، گاہ شبنم اور کبھی خوں ناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

اِک ہوائے بے تکاں سے آخرش مرجھا گیا
زندگی بھر جو محبت کے شجر بوتا رہا

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر
عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا
صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح روتا رہا

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

☼

خون پتّوں پہ جما ہو جیسے
پھول کا رنگ ہرا ہو جیسے

بارہا یہ ہمیں محسوس ہوا
درد سینے کا خدا ہو جیسے

پھول کی آنکھ میں شبنم کیوں ہے
سب ہماری ہی خطا ہو جیسے

کرچیں چبھتی ہیں بہت سینے میں
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

سب ہمیں دیکھنے آتے ہیں مگر
نیند آنکھوں سے خفا ہو جیسے

اب چراغوں کی ضرورت ہی نہیں
چاند اس دِل میں چھپا ہو جیسے

جی میں آتا ہے کہ سجدہ کرلیں
دل کی آواز خدا ہو جیسے

روز آتی تھی ہوا اس جیسی
وہ بھی یوں آیا ہوا ہو جیسے

☼

تم نے بھی کم نصیب پہ کچھ کم نگاہ کی
اس نے تو خیر زندگی اپنی تباہ کی

ہم دونوں دنیادار نہیں ہیں اسی لیے
صورت کوئی نظر نہیں آتی نباہ کی

پتھر سمجھ کے تم جسے ٹھکرا کے چل دیے
اس دل پہ تھی نگاہ بہت مہر وماہ کی

اُن کی نظر میں پیار گناہِ عظیم ہے
توفیق دے خدا انھیں ایسے گناہ کی

حالات بے وفائی پہ مجبور کر گئے
ورنہ اسے بھی چاہ بہت تھی نباہ کی

اپنے کو رشکِ میرؔ سمجھتے ہیں بدؔر جی
گمراہ کر گئی ہے صدا واہ ، واہ کی

☼

بے تاب ہے رنگت کے لیے پیار کی خوشبو
کب سر کے قریب آئے گی تلوار کی خوشبو

مطلع میں دمک اُٹھتا ہے اس ماتھے کا مطلع
اشعار میں آجاتی ہے رُخسار کی خوشبو

کہتی ہے کہ آنگن کی چنبیلی تھے کبھی ہم
کوٹھے پہ تڑپتی ہے گلِ بازار کی خوشبو

دیوانی ہوئی جن کے لیے چاندنی راتیں
وہ نکہتِ گیسو ہے کہ رخسار کی خوشبو

درکار ہے آرائشِ کے لیے رنگ
اِک سر کا لہو مانگے ہے دیوار کی خوشبو

اب اگلے برس یہ درو دیوار نہ ہوں گے
اس گھر سے بہت آتی ہے اشعار کی خوشبو

یاد کسی کی چاندنی بن کر کوٹھے کوٹھے چھٹکی ہے
یاد کسی کی دُھوپ ہوئی ہے زینے زینے اُتری ہے

رات کی رانی صحنِ چمن میں گیسو کھولے سوتی ہے
رات برات اُدھر مت جانا اِک ناگن بھی رہتی ہے

تم کو کیا، تم غزلیں کہہ کر اپنی آگ بجھا لوگے
اس کے جی سے پوچھو جو پتھر کی طرح چپ رہتی ہے

قفل جڑے ہیں اس گھر کی ہر کھڑکی میں دروازوں میں
پھر بھی دروازوں سے اکثر اِک آہٹ جھانکا کرتی ہے

پتھر لے کر گلیوں گلیوں لڑکے پوچھا کرتے ہیں
ہر بستی میں مجھ سے آگے شہرت مری پہنچتی ہے

مدت سے اِک لڑکی کے رخسار کی دُھوپ نہیں آئی
اس لیے میرے کمرے میں اتنی ٹھنڈک رہتی ہے

☼

یہ اُداسی ، دُھواں ، چاندنی چوک میں
چاندنی ہے کہاں چاندنی چوک میں

ایک ہی گشت میں آگ سی لگ گئی
سردیاں ہیں کہاں چاندنی چوک میں

ہر خریدار زہرہ جبیں ، مہ بدن
ہر دکاں کہکشاں چاندنی چوک میں

ایک لڑکی کی صورت میں دیکھا گیا
خواب صد شاعراں چاندنی چوک میں

آج عہدِ گزشتہ کے اِک مہرباں
مل گئے ناگہاں چاندنی چوک میں

میری آنکھوں میں اِک چاندنی چوک تھا
گزری عمرِ رواں چاندنی چوک میں

نقرئی قہقہے ، غم دبائے ہوئے
یہ بہارِ خزاں ، چاندنی چوک میں

مشقِ شعر و سخن میں ملے گا کہیں
لشکرِ شاعراں چاندنی چوک میں

فکرِ اصلاحِ دنیا میں کھوئے ملے
آلِ پیغمبراں چاندنی چوک میں

بیچ بازار میں گا رہا تھا کوئی
آؤ نا میری جاں ، چاندنی چوک میں

دولتِ جسم و جاں کا بھروسہ نہیں
کچھ خرید و میاں چاندنی چوک میں

☼

نہ جانے کتنے تارے تھرتھرا کے ٹوٹ جاتے ہیں
کبھی جو سُرمگیں آنکھوں میں آنسو جھلملاتے ہیں

یہ سنّاٹا کہ اپنی سانس کی آہٹ نہیں ملتی
یہ اندھیارا کہ یادوں کے دیے بھی بجھتے جاتے ہیں

پسینے کے سنہرے قطروں یا اشکوں کی لڑیوں سے
بہر صورت یہ دنیا ہم بناتے ہم سجاتے ہیں

ہر ایک خطِّ بدن اُبھرا ہے ان کا میرے شعروں میں
انھیں اب لوگ غزلوں سے مری پہچان جاتے ہیں

جھکی پلکیں، گھنے گیسو، حسیں دامن سُبک آنچل
جہاں کی تپتی راہوں میں یہ سائے یاد آتے ہیں

نہ جانے ان دِنوں کیوں صبح کچھ سَولائی رہتی ہے
نہ جانے شام ہی سے کیوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

ہمیں کیا، ہم کو مرنا، ہم کو جینا دونوں آتا ہے
ہمیں کیا، ہم تو اپنے خون میں اکثر نہاتے ہیں

☼

ہم بکھر جاتے ہیں تیرگی کی طرح
درد بڑھتا ہے روشنی کی طرح

ہم خدا بن کے آئیں گے ورنہ
ہم سے مل جاؤ آدمی کی طرح

برف سینے کی جیسے جیسے گلی
آنکھ کھلتی گئی کلی کی طرح

جب کبھی بادلوں میں گھرتا ہے
چاند لگتا ہے آدمی کی طرح

کسی روزن ، کسی دریچے سے
سامنے آؤ روشنی کی طرح

سب نظر کا فریب ہے ورنہ
کوئی ہوتا نہیں کسی کی طرح

خوبصورت ، اُداس ، خوفزدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

چاند سورج کے آنے جانے سے کچھ کمی زیادتی نہیں ہوتی
شہر میں دن کے وہ علاقے ہیں جن میں اب رات ہی نہیں ہوتی

دل وہ پوجا کی تھال ہے جس میں ، زندگی پھول رکھنا بھول گئی
اور آنکھیں وہ طاقِ مسجد ہیں جن میں اب روشنی نہیں ہوتی

شام آتی تھی اپنے ساتھ لیے تیری یادوں کے جلتے بجھتے دیے
شام کیا اب تو ساری ساری رات آگ میں روشنی نہیں ہوتی

جلنے والی ہر ایک شے کے لیے آنسوؤں کی بڑی ضرورت ہے
ایسا تھم تھم کے وہ نہیں جلتی جس میں ہلکی نمی نہیں ہوتی

تیرے اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر
دُھوپ کتنی ہی مہرباں ہوجائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

☼

بزمِ آزمائش ہے لوگ اپنے شعروں میں تارے توڑ لاتے ہیں
بدؔر اچھا موقع ہے دل کی بات کہہ جاؤ وہ بھی سننے آتے ہیں

پتھروں پہ سر رکھ کر رات رات روتے ہو کیا خبر نہیں تم کو
یہ بھی سب سمجھتے ہیں ساتھ ساتھ روتے ہیں اپنا جی دُکھاتے ہیں

ہم نے اپنے شعروں میں اپنا دل اُتارا ہے دل میں جو بھی کوئی ہو
وہ ہمارے شعروں کو اپنا عکس کہتے ہیں دیکھ کر لجاتے ہیں

رقصِ نور و نغمہ ہو، بارشِ کرم ہوگی، آج جشنِ عشرت ہے
پتھروں کے سوداگر، پتھروں کے بھاؤ میں دل خرید لاتے ہیں

رُوپ دیس کی کلیو، پنگھٹوں کی سانوریو، کچھ خبر بھی ہے تم کو
ہم تمھارے گاؤں میں پیاسے پیاسے آئے تھے پیاسے پیاسے جاتے ہیں

☼

نکل آئے اِدھر جناب کہاں
رات کے وقت آفتاب کہاں

میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

سیب کھلے ہیں کسی کے گالوں پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

میرے ہونٹوں پر تیری خوشبو ہے
چھو سکے گی انھیں شراب کہاں

نظر سے گفتگو ، خاموش لب ، تمھاری طرح
غزل نے سیکھے ہیں انداز سب تمھاری طرح

جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادرِ آب
دکھائی دُور سے دیتے ہیں سب تمھاری طرح

بلا رہا ہے زمانہ مگر ترستا ہوں
کوئی پکارے مجھے بے سبب تمھاری طرح

ہوا کی طرح میں بے تاب ہوں کہ شاخِ گلاب
لہکتی ہے مری آہٹ پہ اب تمھاری طرح

مثالِ وقت میں تصویرِ صبح و شام ہوں اب
مرے وجود پہ چھائی ہے شب تمھاری طرح

سناتے ہیں مجھے خوابوں کی داستاں اکثر
کہانیوں کے پُراسرار لب تمھاری طرح

ساده ورق پہ اُبھرے گا شاید قلم کا چاند
شہرِ غزل کی رات ہے یادِ صنم کا چاند

دل کی رہِ حیات میں یہ شوخ تمکنت
لہرا رہا ہے تیز ہوا میں عَلم کا چاند

کیا زندگی ہماری گلی تک بھی آئی تھی
یہ گیسوؤں کے پھول یہ نقشِ قدم کا چاند

اس بار تجربوں کی ردائیں نظر پہ ہیں
روشن بہت زیادہ تھا پچھلے جنم کا چاند

آنکھیں نہ کھول دینا، اماوس کی رات ہے
ہاتھوں میں لے کے جھوما کرو جامِ جم کا چاند

دروازے شہرِ درد کے کھلنے دو دوستو
نکلے گا مسکراتا ہوا شامِ غم کا چاند

☼

دل شکستہ کوئی ہم جیسا یہاں دفن ہے کیا
دیر تک رات کو رونے کی صدا آتی ہے

جیسے چشمے پہ نہاتی ہوئی شہزادیِ خواب
چاندنی رات جب اشکوں میں نہا جاتی ہے

کیا یہاں دشتِ تمنا میں کوئی پھول کھلا
اب ادھر روز کئی بار صبا آتی ہے

کسی دستک نے بہت چپکے سے سرگوشی کی
چاند سے چاندنی نزدیک ہوئی جاتی ہے

میری آنکھوں میں اُتر آئے ہیں کالے بادل
جاؤ سو جاؤ کہ موسم بڑا جذباتی ہے

خشک پتوں کو کوئی روند رہا ہے شاید
بال بکھرائے ہوئے بادِ صبا آتی ہے

☼

پیار کی نئی دستک دل پہ پھر سنائی دی
چاند سی کوئی صورت خواب میں دِکھائی دی

کس نے میری پلکوں پہ تتلیوں کے پر رکھے
آج اپنی آہٹ بھی دیر تک سنائی دی

ہم غریب لوگوں کے آج بھی وہی دن ہیں
پہلے کیا اَسیری تھی آج کیا رِہائی دی

بارشوں کے چہرے پر آنسوؤں سے لکھنا ہے
کچھ نہ کوئی پڑھ پائے ایسی روشنائی دی

آسماں زمیں رکھ کر دونوں ایک مٹھّی میں
اِک ذراسی لڑکی نے پیار کی خدائی دی

یہ تنک مزاجی تو خیر اس کی فطرت ہے
ورنہ اس نے چاہت بھی ہم کو انتہائی دی

یہ تناؤ قدرت نے دو دِلوں میں کیوں رکھا
مجھ کو کج کُلاہی دی اس کو کج اَدائی دی

☼

پچھلی رات کی نرم چاندنی شبنم کی خنکی سے رچا ہے
یوں کہنے کو اُس کا تبسم ، برق صفت ہے شعلہ نما ہے

وقت کو ماہ و سال کی زنجیروں میں جکڑ کر کیا پایا ہے
وقت تو ماہ و سال کی زنجیروں میں اور بھی تیز بڑھا ہے

اِک معصوم سے پیار کا تحفہ، گھر کے آنگن میں پایا ہے
اُس کو غم کے پاگل پن میں کوٹھے کوٹھے بانٹ دیا ہے

نظم، غزل، افسانہ، گیت، ایک تراہی غم تھا جس کو ہم نے
کیسا کیسا نام دیا ہے ، کیسے کیسے بانٹ لیا ہے

آہوں کے بادل کیوں دل میں بِن برسے ہی لوگ گئے
اب کے برس ساون کا مہینہ کیسا پیاسا پیاسا گیا ہے

پھول سی ہر تصویر میں ذہن کی دیواروں سے اُتار چکا ہوں
پھر کیوں دل میں کانٹا سا رہ رہ کر چبھتا رہتا ہے

ان آنکھوں کا متوالا پن ، ان ہونٹوں کی جنبش کم کم
نشّہ ہے جو ڈول رہا ہے، جادو ہے جو بول رہا ہے

مجھ کو ان سچی باتوں سے، اپنے جھوٹ بہت پیارے ہیں
جن سچی باتوں سے صدیوں انسانوں کا خون بہا ہے

یارو ، سونا چاندنی بو کر سونا چاندی کاٹو ، جاؤ
ہم نے آنسو کی کھیتی کی نین نگر آباد کیا ہے

بدرؔ تمھاری فکرِ سخن پر ، اِک علامہ ہنس کر بولے
یہ لڑکا نو عمر پرندہ ، اونچا اُڑنا سیکھ رہا ہے

☼

سردیوں کی راتوں میں اپنے اپنے گاؤں میں گردالاؤ کے بیٹھے ہیں
ہم سے کتنے دیوانے تیرے میرے قصّوں میں اپنا غم سناتے ہیں

گاؤں کی کوئی گوری توڑ کر ہر اِک ناطہ دُور دیس جاتی ہے
اِن گھنے درختوں میں آج دف نہیں بجتے ، کھیت سر جھکائے ہیں

رنگ و نور کی گڑیو ، زندگی کی تصویرو ، تم نے رنج و غم میں بھی
اپنی مسکراہٹ سے ہم سے دل شکستوں کے حوصلے بڑھائے ہیں

چاند دیس کے لوگو ، دل تمھارے ہوتا ہے ، پیار تم سمجھتے ہو
ہم تو اپنے بچپن سے تم کو چھونے پانے کی حسرتیں چھپائے ہیں

زندگی تری فکریں کھلتے ہی گلابوں کا رَس نچوڑ لیتی ہیں
پھول جیسی عمروں کے سوچتے ہوئے بچے بوڑھے ہوتے جاتے ہیں

اِک جاتی دنیا میں ایک آتی دنیا میں ، ایک وقفہ ہوتا ہے
اس سیاہ وقفے میں پھول روندے جاتے ہیں کانٹے پہنے جاتے ہیں

چاند سے کوئی کہہ دو ، چاندنی کے شعلوں کے اب الاؤ مہکائے
آج میرے آنگن میں مہکی مہکی زلفوں کے مہکے مہکے سائے ہیں

☼

شاید مرے آنسو سے اُس کا کوئی رشتہ ہے
تپتے ہوئے صحرا میں جو پھول اکیلا ہے

جھنجھلا کے کسی لمحہ وہ توڑ بھی سکتا ہے
اِک بچّے کی انگلی سے لپٹی رگِ دنیا ہے

سنّاٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

ہوسکتا ہے کل سورج سوتا ہی مجھے پائے
اِک سانپ مرے دل میں سمٹا ہوا بیٹھا ہے

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں
خاموش درختوں پر سہما ہوا نغمہ ہے

اب روئے کہاں ساون اب تڑپے کہاں بادل
آنگن نہ بغیچہ ہے اِک چھوٹا سا کمرہ ہے

ٹھہری ہوئی جھیلوں میں اِک برقِ رواں جیسے
ان حیرتی آنکھوں میں یوں 'دوڑتی دنیا' ہے

جیسے ورقِ گل پر انگارہ کوئی رکھ دے
یوں دستِ حنائی پر آنسو ابھی ٹپکا ہے

اپنا چاند میں ڈھونڈ رہا ہوں تیرے چاند ستاروں میں
شاید سچا موتی بھی ہو شیشے کے ان پاروں میں

شاخ پہ جتنے پھول ہیں اکثر پیغمبر سے لگتے ہیں
لیکن میں تو اس کی مانوں جو ہنس دے انگاروں میں

لفظ سیاہی کا پردہ ہیں غور سے دیکھو پس منظر
پھول سے چہرے چھپے ہوئے ہیں کاغذ کے انباروں میں

کمرے ویراں ، آنگن خالی ، پھر یہ کیسی آوازیں
شاید میرے دل کی دھڑکن چنی ہے ان دیواروں میں

تقریروں کا جادو اکثر جھوٹ سے ملتا جلتا ہے
اسی لیے تو بات کہی ہے ہم نے صرف اشاروں میں

تیرا جسم اشعار کے آئینہ میں ایسا لگتا ہے
چاند کو جیسے قید کیا ہو شیشے کی دیواروں میں

تہذیبوں کا سورج جب چھپ جاتا ہے تو چپکے سے
الفت دیے جلا جاتی ہے دل کے گہرے غاروں میں

چھوٹی سی تھیلی کو دکھا کر اِک سوداگر نے یہ کہا
صدہا شاعر مل جائیں گے اتنے کم دیناروں میں

☼

وہ پھول تیرے ہونٹوں کے چھونے سے جو کھلا
وہ پھول ، اور جون کی آتش بھری ہوا
نیزوں نے مجھ کو جیسے زمیں سے اُٹھا لیا
میں تیرے نرم سینے سے جس دم جدا ہوا
جیسے کہ سارے شہر کی بجلی چلی گئی
آنکھیں کھلی کھلی تھیں مگر سوجھتا نہ تھا
تصویر میری پردۂ تخلیق بن گئی
چڑیا نے اس کی آڑ میں اِک گھر بسا لیا
باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیے
کمرے میں نرم نرم اُجالا سا بھر گیا

☼

سر درد ، جیسے نیند کے سینے پہ سو گیا
ان پھول جیسے ہاتھوں نے ماتھا جو نہی چھوا
اِک لڑکی ، ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اُجلی ، دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا
سنّاٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا
ٹہنی گلاب کی مرے سینے سے لگ گئی
جھٹکے کے ساتھ کار کا رکنا غضب ہوا

☼

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

اُجالوں کی پریاں نہانے لگیں
ندی گنگنائی خیالات کی

میں چپ تھا تو چلتی ہوا رُک گئی
زباں سب سمجھتے ہیں جذبات کی

مقدر مری چشمِ پُر آب کا
برستی ہوئی رات برسات کی

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

☼

مری نظر میں خاک ، ترے آئینے پہ گرد ہے
یہ چاند کتنا زرد ہے ، یہ رات کتنی سرد ہے

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سبھی مشین ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن نہ کوئی مرد ہے

خدا کی نظموں کی کتاب ساری کائنات ہے
غزل کے شعر کی طرح ہر ایک فرد ، فرد ہے

حیات آج بھی کنیز ہے حضورِ جبر میں
جو زندگی کو جیت لے وہ زندگی کا مرد ہے

اُسے تبرکِ حیات کہہ کے پلکوں پر رکھوں
اگر مجھے یقین ہو یہ راستے کی گرد ہے

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
انھیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا کتنا سرد ہے

☼

رات سے جی ہے سوگوار بہت
یاد آؤ نہ آج یار بہت

پاؤں میں دم رہے، دیار بہت
ہاتھ چلتے ہوں روزگار بہت

دل میں ہر وقت ایک ہنگامہ
شہر تنہا ہے شہر یار بہت

دیکھ لیں مہربانیاں تری
زندگی بن نہ غمگسار بہت

کیا کوئی یار آنے والا ہے
وقت پوچھو ہو، آج یار بہت

رات کہتی ہے بدؔر سو جاؤ
ہو چکا اس کا انتظار بہت

☼

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے
مسافر کو گلی پہچانتی ہے

ترے بیمار کا اب تب لگا ہے
یہ حالت گفتنی کم ، دیدنی ہے

نہ جانے کس طرف سے آ رہی ہیں
ہواؤں میں بڑی افسردگی ہے

یہ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں
ستاروں کے لبوں پر کپکپی ہے

ابھی کچھ زندگی کا آسرا ہے
چراغوں میں ابھی کچھ روشنی ہے

سحر کے قافلے یہ جانتے ہیں
ابھی اِک رات کی منزل پڑی ہے

☼

جب تک نگارِ دشت کا سینہ دُکھا نہ تھا
صحرا میں کوئی لالۂ صحرا کھلا نہ تھا

دو جھیلیں اس کی آنکھوں میں لہرا کے سو گئیں
اس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا

جاگی نہ تھیں نسوں میں تمنّا کی ناگنیں
اس گندمی شراب کو جب تک چکھا نہ تھا

ڈھونڈا کرو جہانِ تحیّر میں عمر بھر
وہ چلتی پھرتی چھاؤں ہے میں نے کہا نہ تھا

اِک بے وفا کے سامنے آنسو بہاتے ہم
اتنا ہماری آنکھوں کا پانی مرا نہ تھا

دو کالے ہونٹ ، جام سمجھ کر چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کو لائے تھے
ایک ہم ہی ایسے تھے کہ ہمارا خدا نہ تھا

وہ کالی آنکھیں ، شہر میں مشہور تھیں بہت
تب ان پہ موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھا نہ تھا

میں صاحبِ غزل تھا حسینوں کی بزم میں
سر پر گھنیرے بال تھے ماتھا کھلا نہ تھا

☼

موجۂ گل کے پیچھے پڑ کر کیوں دیوانی ہوئی ہے مٹّی
ٹھوکر کھا کر خود آئے گا جس کی جہاں لکھی ہے مٹّی

گلیاں گھپ ہیں، میداں چپ ہیں اور وہ دیوانہ بھی نہیں
مٹّی کا دل بیٹھ گیا ہے کس کی آج اُٹھی ہے مٹّی

آنکھیں آنسو، دل بھی آنسو، شاید ہم سرتا پا آنسو
تھوڑی مٹّی اور ملادے ابھی بہت گیلی ہے مٹّی

مٹّی کا اِک اور کھلونا زیست بنانے والی ہے
خاموشی سے دیکھ تو آؤ اس آنچل میں بندھی ہے مٹّی

آہن جیسی دیوار میں ہو یا انسان کا جسمِ خاکی
مٹّی کی فطرت آزادی ہے قید نہیں رہ سکتی ہے مٹّی

پچھلے سال یہیں بہت سی ٹوٹی قبریں منہ کھولے تھیں
دھرتی کے زخموں کو کتنی جلدی بھر دیتی ہے مٹّی

میں ٹھہرا مٹّی کا مادھو، جا دیوانی راہ لے اپنی
تو سونے چاندی کی مورت خود کو کیوں کرتی ہے مٹّی

یہ جو دل سے نازک تر ہے پہلے اِک پتھر کا بت تھی
صدیوں یہ آنکھیں روئی ہیں، صدیوں تک بھیگی ہے مٹّی

ہر ذرّے میں راز نیا ہے گو مٹّی کے تم ہو کھلونے
اِک اِک شعر میں بدرؔ تمھارے جیسے بول رہی ہے مٹّی

☼

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

ان پہاڑوں میں رہتے ہیں ہمزاد
بول کر دیکھو بولتا ہے کوئی

آج میں جاگوں گا کہ سوتے میں
میری پلکوں کو چومتا ہے کوئی

میرا شیطان مر گیا شاید
میرے سینے پہ سو رہا ہے کوئی

رنگ یہ بھی بہت پرانا ہے
سوچتا کوئی ، بولتا ہے کوئی

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا
کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

☼

کوئی ہاتھ نہیں خالی ہے
بابا ، یہ نگری کیسی ہے

کوئی کسی کا درد نہ جانے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

اُس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اس نے مجھ سے نفرت کی ہے

پھول دوا جیسے مہکے ہیں
کس بیمار کی صبح ہوئی ہے

جیسے صدیاں بیت چکی ہیں
پھر بھی آدھی رات ابھی ہے

کیسے کٹے گی تنہا تنہا
اتنی ساری عمر پڑی ہے

ہم دونوں کی خوب نبھے گی
میں بھی دُکھی ہوں وہ بھی دُکھی ہے

اب غم سے کیا ناطہ توڑیں
ظالم بچپن کا ساتھی ہے

دل کی خاموشی پہ نہ جاؤ
راکھ کے نیچے آگ دبی ہے

☼

میری غزل کی طرح اس کی بھی حکومت ہے
تمام ملک میں وہ سب سے خوبصورت ہے

کبھی کبھی کوئی انسان ایسا لگتا ہے
پرانے شہر میں جیسے نئی عمارت ہے

جمی ہے دیر سے کمرے میں غیبتوں کی نشست
فضا میں گرد ہے، ماحول میں کدورت ہے

بہت دِنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

یہ زائرانِ علی گڑھ کا خاص تحفہ ہے
مری غزل کا تبرک دِلوں کی برکت ہے

☼

ذرّوں میں کنمناتی ہوئی کائنات ہوں
جو منتظر ہے جسموں کی میں وہ حیات ہوں

دونوں کو پیاسا مار رہا ہے کوئی یزید
یہ زندگی حسین ہے اور میں فرات ہوں

"نیزہ زمین پہ گاڑ کے گھوڑے سے کود جا"
پر میں زمین پہ آبلہ پا خالی ہات ہوں

کیسا فلک ہوں جس پہ سمندر سوار ہے
سورج بھی میرے سر پر ہے میں کیسی رات ہوں

اندھے کنویں میں مار کے جو پھینک آئے تھے
ان بھائیوں سے کہیو، ابھی تک حیات ہوں

آتی ہوئی ٹرین کے جو آگے رکھ گئی
اس ماں سے یہ نہ کہنا بقیدِ حیات ہوں

بازار کا نقیب سمجھ کر مجھے نہ چھیڑ
خاموش رہنے دے میں ترے گھر کی بات ہوں

☼

اب ہوئی داستاں رقم بابا
انگلیاں ہوگئیں قلم بابا

کاغذی جوئے شیر لائے ہیں
اپنا تیشہ یہی قلم بابا

چاند اکثر اُداس رہتا ہے
اس کو آخر ہے کس کا غم بابا

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا

عشق نے یہ بھی رتبہ ہم کو دیا
لوگ کہتے ہیں محترم بابا

اب تو تنہائیاں بھی پوچھتی ہیں
ہے ترا بھی کوئی بابا

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پروئے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا کچھ کہیے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

ہر جنم میں اُسی کی چاہت تھے
ہم کسی اور کی امانت تھے

اس کی آنکھوں میں جھلملاتی ہوئی
ہم غزل کی کوئی علامت تھے

تیری چادر میں تن سمیٹ لیا
ہم کہاں کے دراز قامت تھے

جیسے جنگل میں آگ لگ جائے
ہم کبھی اتنے خوبصورت تھے

پاس رہ کر بھی دُور دُور رہے
ہم نئے دَور کی محبت تھے

اس خوشی میں مجھے خیال آیا
غم کے دن کتنے خوبصورت تھے

دن میں ان جگنوؤں سے کیا لینا
یہ دیے رات کی ضرورت تھے

☼

ریت بھری ہے ان آنکھوں میں آنسو سے تو دھولینا
کوئی سوکھا پیڑ ملے تو اس سے لپٹ کے رولینا

اس کے بعد بہت تنہا ہو جیسے جنگل کا راستہ
جو بھی تم سے پیار سے بولے ساتھ اسی کے ہولینا

کچھ تو ریت کی پیاس بجھاؤ جنم جنم کی پیاسی ہے
ساحل پر چلنے سے پہلے اپنے پاؤں بھگولینا

میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری
اوپر اوپر ہنستے رہنا ، گہرائی میں رولینا

روتے کیوں ہو دل والوں کی قسمت ایسی ہوتی ہے
ساری رات یونہی جاگو گے دن نکلے تو سولینا

☼

لہروں میں ڈوبتے رہے دریا نہیں ملا
اس سے بچھڑ کے پھر کوئی ویسا نہیں ملا

وہ بھی بہت اکیلا ہے شاید مری طرح
اس کو بھی کوئی چاہنے والا نہیں ملا

ساحل پہ کتنے لوگ مرے ساتھ ساتھ تھے
طوفاں کی زد میں آیا تو تنکا نہیں ملا

دو چار دن تو کتنے سکون سے گزر گئے
سب خیریت رہی کوئی اپنا نہیں ملا

☼

بھولے بسرے کہیں شبنم کہیں گوہر برسے
اور اس دل کی طرف برسے تو پتھر برسے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جوان کمروں کے اندر برسے

کون کہتا ہے کہ رنگوں کے فرشتے اُتریں
کچھ بھی برسے مگر اس بار تو گھر گھر برسے

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اُٹھے اپنے ہی دل پر برسے

☼

سرکش پہاڑیوں میں جھرنوں کا بانکپن ہے
کتنا عظیم فانی انسان کا بدن ہے

خوابوں میں ان گلابی ہونٹوں پہ مسکراہٹ
مہتاب سو رہا ہے بیدار اِک کرن ہے

شاید زمیں کے سینے میں کوئی آسماں ہے
دریا کی تہہ میں لرزاں تاروں کی انجمن ہے

اوراقِ سادہ لے کر پریاں اُتر رہی ہیں
پھر سینۂ سخن میں اشعار کی چبھن ہے

اس برگِ گل پہ لفظوں کے موتی تھرتھرائے
شبنم ہوا کے رُخ پر یا بولتا چمن ہے

سینے پہ پاؤں رکھ کر دُنیا گزر رہی ہے
گل رنگ خاکِ دل ہے گلنار یہ چمن ہے

ساحل پہ شام کتنی گمبھیر ہے کہ دریا
رُک رُک کے بہہ رہا ہے آواز میں تھکن ہے

شہرِ نگار میری خاطر اُداس مت ہو
آبِ رواں بھی بے گھر، خوشبو بھی بے وطن ہے

بے تحاشا سی لااُبالی ہنسی
چھن گئی ہم سے وہ جیالی ہنسی

لب کھلے جسم مسکرانے لگا
پھول کا کھلنا تھا کہ ڈالی ہنسی

مسکرائی خدا کی محویت
یا ہماری ہی بے خیالی ہنسی

کون بے درد چھین لیتا ہے
میرے پھولوں کی بھولی بھالی ہنسی

وہ نہیں تھا وہاں تو کون تھا پھر
سبز پتّوں میں کیسے لالی ہنسی

دُھوپ میں کھیت گنگنانے لگے
جب کوئی گاؤں کی جیالی ہنسی

ہنس پڑی شام کی اُداس فضا
اس طرح چائے کی پیالی ہنسی

میں کہیں جاؤں ہے تعاقب میں
اس کی وہ جان لینے والی ہنسی

☼

رات اِک خواب ہم نے دیکھا ہے
پھول کی پنکھڑی کو چوما ہے

دل کی بستی پرانی دلّی ہے
جو بھی گزرا ہے اس نے لوٗٹا ہے

خندۂ گل فریب ہے گل کا
رات بھر چپکے چپکے رویا ہے

ہم تو کچھ دیر ہنس بھی لیتے ہیں
دل ہمیشہ اُداس رہتا ہے

اب بجز تیری یاد کے اے دوست
اس خرابے میں کون آتا ہے

پیسہ ہاتھوں کا میل ہے بابا
زندگی چار دن کا میلہ ہے

کوئی مطلب ضرور ہوگا میاں
یوں کوئی کب کسی سے ملتا ہے

تم اگر مل بھی جاؤ تو بھی ہمیں
حشر تک انتظار کرنا ہے

☼

آج دریا، چڑھا چڑھا سا ہے
کوئی ہم سے خفا خفا سا ہے

جسم جیسے بھرا بھرا ساغر
گفتگو میں نشہ نشہ سا ہے

ناک نقشہ بس آپ ہی جیسا
نام بھی کچھ بھلا بھلا سا ہے

شہر یادوں کا اِک بسایا تھا
اب نشاں بھی مٹا مٹا سا ہے

دل سے اِک روشنی جہاں میں تھی
یہ دِیا بھی بجھا بجھا سا ہے

باغ ہے ایک پھول لاکھوں ہیں
رنگ سب کا جدا جدا سا ہے

شبنمی آگ بھی جلاتی ہے
پھول کا دل جلا جلا سا ہے

کس کو فرصت کہ اِک نظر دیکھے
بدؔر، تنہا بجھا بجھا سا ہے

☼

اگر تلاش کروں کوئی مل ہی جائے گا
مگر تمھاری طرح مجھ کو کون چاہے گا

تمھیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

نہ جانے کب ترے دل پر نئی سی دستک ہو
مکاں خالی ہوا ہے تو کوئی آئے گا

میں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں
اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا

تمھارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسا ہے
تمھارے بعد یہ موسم بہت ستائے گا

کہیں چاند راہوں میں کھو گیا کہیں چاندنی بھی بھٹک گئی
میں چراغ وہ بھی بجھا ہوا میری رات کیسے چمک گئی

مری داستان کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
مرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک گئی

بھلا ہم ملے بھی تو کیا ملے وہی دُوریاں وہی فاصلے
نہ کبھی ہمارے قدم بڑھے نہ کبھی تمھاری جھجک گئی

ترے ہاتھ سے مرے ہونٹ تک وہی انتظار کی پیاس ہے
مرے نام کی جو شراب تھی کہیں راستے میں چھلک گئی

تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں
تری یاد شاخِ گلاب ہے جو ہوا چلی تو لچک گئی

☼

خواہشیں ، جیسے افریقہ کی بیٹیاں ، جنگِ آزادی میں سر سے باندھے کفن
حلقۂ نور میں آگے بڑھتے ہوئے دُھوپ کو چھیڑتے آبنوسی بدن

ان ہواؤں سے موسم بدلنے لگا دُھوپ میں پیار کی نرم چمکار ہے
پھر کبوتر کے جوڑوں کے دل میں چبھی تنکے چن چن کے لانے کی فطری چبھن

شہر وصحرا کی تقسیم ممکن نہیں ، ایک قوت ہے جس کے بہت رُوپ ہیں
ان پہاڑوں میں بھی پیار کا ظلم ہے ، ان مشینوں میں بھی ظلم کا پیار پن

مرنے والے مصور کے تکیے تلے ایک کاغذ ملا جس پہ یہ درج تھا
روشنی کے لباسوں سے لپٹا ہوا آئینہ خانے میں خوشبوؤں کا بدن

اُونچے گرجا گھروں میں گھرے نوجواں راہبوں کے دِلوں میں دَبی خواہشیں
جیسے بیروت کی ساحلی ریت پر ، دُھوپ کھاتی ہوئی لڑکیوں کے بدن

☼

مری زندگی بھی مری نہیں یہ ہزار خانوں میں بٹ گئی
مجھے ایک مٹھی زمین دے ، یہ زمین کتنی سمٹ گئی

تری یاد آئے تو چپ رہوں ذرا چپ رہوں تو غزل کہوں
یہ عجیب آگ کی بیل تھی مرے تن بدن سے لپٹ گئی

مجھے لکھنے والا لکھے بھی کیا، مجھے پڑھنے والا پڑھے بھی کیا
جہاں میرا نام لکھا گیا وہیں روشنائی اُلٹ گئی

نہ کوئی خوشی نہ ملال ہے کہ سبھی کا ایک سا حال ہے
ترے سکھ کے دن بھی گزر گئے مری غم کی رات بھی کٹ گئی

مری بند پلکوں پر ٹوٹ کر کوئی پھول رات بکھر گیا
مجھے سسکیوں نے جگا دیا مری کچی نیند اُچٹ گئی

☼

پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے

ہماری شاخ کا نوخیز پتّا
ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے

اندھیری رات کا تنہا مسافر
میری پلکوں پہ اب سہما ہوا

سمیٹو اور سینے میں چھپا لو
یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

مجھے ان نیلی آنکھوں نے بتایا
تمھارا نام پانی پہ لکھا ہے

☼

اب تیرے میرے بیچ ذرا فاصلہ بھی ہو
ہم لوگ جب ملیں تو کوئی دوسرا بھی ہو

تو جانتا نہیں مری چاہت عجیب ہے
مجھ کو منا رہا ہے کبھی خود خفا بھی ہو

تو بے وفا نہیں ہے مگر بے وفائی کر
اس کی نظر میں رہنے کا کچھ سلسلہ بھی ہو

پت جھڑ کے ٹوٹتے ہوئے پتوں کے ساتھ ساتھ
موسم کبھی تو بدلے گا یہ آسرا بھی ہو

چپ چاپ اس کو بیٹھ کے دیکھوں تمام رات
جاگا ہوا بھی ہو کوئی سویا ہوا بھی ہو

اس کے لیے تو میں نے یہاں تک دُعائیں کیں
میری طرح سے کوئی اسے چاہتا بھی ہو

☼

وہی تاج ہے وہی تخت ہے وہی زہر ہے وہی جام ہے
یہ وہی خدا کی زمین ہے یہ وہی بتوں کا نظام ہے

بڑے شوق سے مرا گھر جلا، کوئی آنچ تجھ پہ نہ آئے گی
یہ زباں کسی نے خرید لی، یہ قلم کسی کا غلام ہے

یہاں ایک بچّے کے خون سے جو لکھا ہوا ہے اسے پڑھیں
ترا کیرتن ابھی پاپ ہے ابھی میرا سجدہ حرام ہے

میں یہ مانتا ہوں مرے دیے تری آندھیوں نے بجھا دِیے
مگر ایک جگنو ہواؤں میں ابھی روشنی کا امام ہے

مرے فکر و فن تری انجمن، نہ عروج تھا نہ زوال ہے
مرے لب پہ تیرا ہی نام تھا مرے لب پہ تیرا ہی نام ہے

☼

کبھی تو شام ڈھلے اپنے گھر گئے ہوتے
کسی کی آنکھ میں رہ کر سنور گئے ہوتے

سنگار دان میں رہتے ہو آئینے کی طرح
کسی کے ہاتھ سے گر کر بکھر گئے ہوتے

غزل نے بہتے ہوئے پھول چن لیے ورنہ
غموں میں ڈوب کر ہم لوگ مر گئے ہوتے

عجیب رات تھی کل تم بھی آ کے لوٹ گئے
جب آ گئے تھے تو پل بھر ٹھہر گئے ہوتے

بہت دنوں سے ہے دل اپنا خالی خالی سا
خوشی نہیں تو اُداسی سے بھر گئے ہوتے

☼

کہیں پلکیں اوس سے دھو گئیں کہیں دل کو پھولوں سے بھر گئی
تری یاد سولہ سنگار ہے جسے چھو دیا وہ سنور گئی

میں سنہرے پتّوں کا پیڑ ہوں، میں خزاں کا حسن و وقار ہوں
مرے بال چاندی کے ہو گئے مرے سر پہ دُھوپ ٹھہر گئی

مرا شاعرانہ سا خواب بھی جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
انھیں خداؤں کے خوف سے وہ چڑھی ندی میں اُتر گئی

تری آرزو تری جستجو میں بھٹک رہا تھا گلی گلی
مری داستاں تری زلف ہے جو بکھر بکھر کے سنور گئی

انھیں دو گھروں کے قریب ہی کہیں آگ لے کے ہوا بھی تھی
نہ کبھی تمھاری نظر گئی نہ کبھی ہماری نظر گئی

نہ غموں کا میرے حساب لے نہ غموں کا اپنے حساب دے
وہ عجیب رات تھی کیا کہیں جو گزر گئی سو گزر گئی

☼

پہلا سا وہ زور نہیں ہے میرے دُکھ کی صداؤں میں
شاید پانی نہیں رہا ہے اب پیاسے دریاؤں میں

جس بادل کی آس میں جوڑے کھول لیے ہیں سہاگن نے
وہ پربت سے سر ٹکرا کر برس چکا صحراؤں میں

جانے کب تڑپے اور چمکے سونی رات کو پھر ڈس جائے
مجھ کو ایک روپہلی ناگن بیٹھی ملی ہے گھٹاؤں میں

پتّا تو آخر پتّا تھا گنجان گھنے درختوں نے
زمین کو تنہا چھوڑ دیا ہے اتنی تیز ہواؤں میں

دن بھر دُھوپ کی طرح سے ہم چھائے رہتے ہیں دنیا پر
رات ہوئی تو سمٹ کے آ جاتے ہیں دل کی گپھاؤں میں

کھڑے ہوئے جو ساحل پر تو دم میں پلکیں بھیگ گئیں
شاید آنسو چھپے ہوئے ہوں صبح کی نرم ہواؤں میں

رات کی راہ میں تاروں کی کماں روشن ہے
چاند میں کون ہے یہ کس کا مکاں روشن ہے

جس کو دیکھو مرے ماتھے کی طرف دیکھے ہے
درد ہوتا ہے کہاں اور کہاں روشن ہے

یاد جب گھر کی کبھی آتی ہے تو لگتا ہے
رات کی راہ میں شیشے کا مکاں روشن ہے

چاند جس آگ میں جلتا ہے اُسی شعلے سے
برف کی وادی میں کہرے کا دُھواں روشن ہے

جیسے دریاؤں میں خاموش چراغوں کا سفر
ایسا نس نس میں مرے دردِ رواں روشن ہے

صبح سے ڈھونڈ رہے تھے کہ کہاں ہے سورج
اب نظر آئے ہو تو سارا جہاں روشن ہے

آس

☼

میں نگارِ فکر و نگاہ کو کبھی بھول کر بھی صدا نہ دوں
یہ عجیب شرطِ وفا ہوئی کہ جو تم کہو میں وہی کہوں

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنھیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

مری آرزو ہے کہ ایک رات بس ایک چاندنی رات میں
میں خموش برف کی وادیوں کی اُداس بانہوں میں سو رہوں

یہ ہوا نہ جانے کہاں کہاں بھری دوپہر میں لیے پھرے
مرے برگِ دل ذرا ٹھہر جا تجھے آنسوؤں سے میں سینچ لوں

کسی مصلحت سے بہار خود مرے لب کے پاس ٹھہر گئی
مری آرزو تھی خزاں کے خشک اُداس ہونٹوں کو چوم لوں

یہ سفید پھول کی چادریں نیم شبی کا بُنا کفن
مجھے کچھ نہ دو یہیں رہنے دو کہ اسی گلی کی میں خاک ہوں

میں تو آنسوؤں کا سکوت ہوں لبِ شعر مجھ کو صدا نہ دے
نہ کبیر ہوں، نہ نظیرؔ ہوں نہ میں میرؔ ہوں نہ بشیرؔ ہوں

☼

ہم کو کافی ہیں یہی حلقہ زنجیرِ سخن
جاؤ مل جل کے تمھیں بانٹ لو جاگیرِ سخن

وارثِ ملکِ غزل روئے تو رو لینے دو
غسلِ اشکیں سے ہوا کرتی ہے تطہیرِ سخن

زندگی رات ہے اور رات بھی بیمار کی رات
درد بن بن کے چمکتی رہے تنویرِ سخن

گفتگو جیسے کہیں دور غزل گائے کوئی
خامشی جیسے کہ لب کھولے ہو تصویرِ سخن

ضبط کی دھار سے کٹ جاتا ہے آہن کا جگر
لوگ پھولوں پہ رواں کرتے ہیں شمشیرِ سخن

ہم بھی آئینہ صفت تھے کبھی لیکن اب تو
اپنے ماتھے پہ اُبھر آئی ہے تحریرِ سخن

ہم جو مٹ جائیں گے مٹ جائے گی تہذیبِ غزل
اپنی تقدیر میں پوشیدہ ہے تقدیرِ سخن

واہ واہ کیسی میاں آہ بھی کرنی ہو محال
واقعی سینے میں لگ جائے اگر تیرِ سخن

بدؔر ہر فرد کو انسان نہیں کہہ سکتے
بدؔر ہر شعر میں ہوتی نہیں تاثیرِ سخن

☼

محفلِ مے کشاں ، کوچۂ دلبراں
ہر جگہ ہو لیے اب چلیں دل کہاں

مصلحت چاہتی ہے کہ منزل ملے
اور دل ڈھونڈتا ہے کوئی کارواں

چاندنی بھی مری طرح حیرت میں ہے
چھپ گیا کوئی آواز دے کر کہاں

جانی پہچانی ہے ہر ادا ، ہر نظر
ہاں ، مگر یہ نہیں یاد دیکھا کہاں

رات یوں غم نے پھر دل میں آواز دی
جیسے صحرا کی مسجد میں شب کی اذاں

گرد اُڑ اُڑ کے منہ اپنا دیکھا کرے
رکھی ہے راہ میں آئینوں کی دُکاں

کچھ تو میں بھی بہت دل کا کمزور ہوں
کچھ محبت بھی ہے فطرتاً بدگماں

تذکرہ کوئی ہو ذکر تیرا رہا
اوّل و آخرش ، درمیاں درمیاں

جانے کس دیس سے دل میں آجاتے ہیں
چاندنی رات میں درد کے کارواں

درمیاں میں نہ لائیں خدا کو بھی ہم
بس وہی وہ سنے جس کی ہے داستاں

بدؔر صاحب ادھر کا نہ رُخ کیجیے
دلّی ، لاہور ہیں شہرِ جادوگراں

☼

خوشبو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا
پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سرخ سرخ پھولوں میں جب مسکراؤں گا

سونے کے پھول پتّے گریں گے زمین پر
میں زرد زرد شاخوں پہ جب گنگناؤں گا

یہ لکڑیاں جو خشک ہیں بے برگ وبار ہیں
ان کو میں اپنی آگ میں جلنا سکھاؤں گا

دینار خوب برسیں گے آنگن میں ساری رات
میں خواب کے شجر کی وہ شاخیں ہلاؤں گا

ڈھل جائیں گی بدن پہ جمی دُھوپ کی تہیں
اپنے لہو میں آج میں ایسا نہاؤں گا

اِک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے
پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

یہ رات پھر نہ آئے گی بادل برسنے دے
میں جانتا ہوں صبح تجھے بھول جاؤں گا

اس دن بجائے اوس کے ٹپکے گا سرخ خون
تلوار لے کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

جب رات کے سپرد مجھے کرنے آؤ گے
رومال روشنی کا ہوا میں اڑاؤں گا

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے لڑیں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں میں مسکراؤں گا

☼

وقتِ رخصت کہیں تارے، کہیں جگنو آئے
ہار پہنانے مجھے پھول سے بازو آئے

بس گئی ہے مرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے

میں نے دن رات خدا سے یہ دُعا مانگی تھی
کوئی آہٹ نہ ہو در پہ مرے اور تو آئے

اس کی باتیں کہ گل ولالہ پہ شبنم برسے
سب کو اپنانے کا اس شوخ کو جادو آئے

ان دِنوں آپ کا عالم بھی عجب عالم ہے
چوٹ کھایا ہوا جیسے کوئی آہو آئے

اُس نے چھوکر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد، مری آنکھوں میں آنسو آئے

☼

زخم یوں مسکرا کر کھلتے ہیں
جیسے وہ دل کو چھو کے گزرے ہیں

درد کا چاند آنسوؤں کے نجوم
دل کے آنگن میں آج اُترے ہیں

راکھ کے ڈھیر جیسے سرد مکاں
چاند اُن بدلیوں میں رہتے ہیں

آئینوں کا کوئی قصور نہیں
ان میں اپنے ہی عکس ہوتے ہیں

غور سے دیکھ خاک تنہا نہیں
ساتھ پھولوں کے رنگ اُڑتے ہیں

اب شبِ ہجر بھی نہیں آتی
ان دِنوں ہم بہت اکیلے ہیں

ان سے احوالِ شب سنو صاحب
بدؔر جی رات رات گھومے ہیں

☼

کس دیس میں میں یہ قافلۂ وقت رُکا ہے
عارض کے اُجالے ہیں نہ زلفوں کی گھٹا ہے

کچھ میری نگاہوں کے تلے دھند بہت ہے
کچھ جشنِ چراغاں سے اندھیرا ابھی بڑھا ہے

میں نے تیری باتوں کو کبھی جھوٹ کہا تھا
اس جرم پہ ہر جھوٹ کو سچ مان لیا ہے

اے شوخ غزالو، یہاں دو پھول تو رکھ دو
اس قبر میں خوابیدہ محبت کا خدا ہے

کچھ دیر میں سانسوں کی یہ آہٹ نہ ملے گی
دل رات کے سناٹے میں یوں ڈوب رہا ہے

☼

صورتِ شمع ساری رات جلو
صبح لیکن مثالِ غنچہ ہنسو

چاند کا داغ دیکھنے والو
اپنے دامن کے داغ بھی دیکھو

چاہے آنکھوں کی روشنی لے لو
آنسوؤ ، آج رات بھر چمکو

آؤ اِک دوسرے کا غم بانٹیں
کچھ ہماری سنو کچھ اپنی کہو

کون جانے کہاں بچھڑ جائیں
راہ تاریک ہے قریب رہو

یہ زمیں مدتوں کی پیاسی ہے
آنسوؤ ! دل پہ ٹوٹ کر برسو

وقت سو منصفوں کا منصف ہے
وقت آئے گا انتظار کرو

چشم مانگے ہے آج دل کا لہو
بدؔر صاحب کا کوئی شعر پڑھو

☼

بدؔر ، دو آنکھیں بہت ڈھونڈ رہی ہیں تم کو
چاند کی چودھویں تاریخ ہے ، اُوپر دیکھو

رات سوئی ہوئی رعنائیوں نے مجھ سے کہا
ہم تمھاری ہی غزل ہیں کبھی ہم کو بھی کہو

چاندنی رات میں کہہ جاتی ہے آہٹ جیسے
ہم بہت پاس ہیں آواز نہ دو ہم کو سنو

جس سے امیدِ وفا ہوگی وہی دکھ دے گا
بے وفا جان کے چاہو جسے اب کی چاہو

اُس کی قدرت میں نہیں رُک کے کوئی بات سنے
وقت آواز ہے آواز کو آواز نہ دو

منتظر کب سے ہیں اوراقِ کتابِ ہستی
دل کا کچھ رنگ کرو نوکِ قلم کو چومو

ایک آواز بہت کافی ہے سوتے کے لیے
لوگ سمجھیں گے بنے لیٹے ہو اب جاگ پڑو

آج کمرے میں نہیں بیٹھنے والا موسم
برف گرنے کی خبر گرم ہے گھر سے نکلو

☼

دُھوپ کھیتوں میں اُتر کر زعفرانی ہوگئی
سرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہوگئی

جیسے جیسے عمر بھیگی سادہ پوشاکی گئی
سوٹ پیلا، شرٹ نیلی، ٹائی دھانی ہوگئی

اس کی اُردو میں بھی اب کی مغربی لہجہ ملا
کالے بالوں کی وہ رنگت زعفرانی ہوگئی

سانپ کے بوسے میں کیسا پیار تھا کہ فاختہ
پھڑپھڑاکر اِک صدائے آسمانی ہوگئی

نرم ٹہنی دُھند کی یلغار کو سہتی ہوئی
شاخ کی بانہوں میں آکر جاودانی ہوگئی

☼

تم نے دیکھا کدھر گئے تارے
کس کی آواز پر گئے تارے

یہ کہیں شہر آرزو تو نہیں
چلتے چلتے ٹھہر گئے تارے

آج آثارِ صبح سے پہلے
وادیوں میں اُتر گئے تارے

سہمے سہمے ، بجھے بجھے مغموم
سر جھکائے گزر گئے تارے

بدؔر کچھ واں کی بھی خبر ہے تمھیں
آنچلوں پر بکھر گئے تارے

☼

الزام ، بے وفائی کے ، ان کو دے رہا ہوں
شک ہو رہا ہے مجھ کو میں خود ہی بے وفا ہوں

ہر جسمِ گل فروشاں اب مرکزِ نظر ہے
تم سے بچھڑ کے کتنا آوارہ ہو گیا ہوں

اس شامِ بے کسی میں دل کی خبر نہیں ہے
جب سے کہاں کہاں میں آواز دے رہا ہوں

بیتے ہوئے دِنوں کے غم یاد آ گئے ہیں
اُن کو گلے لگا کر میں آج رو پڑا ہوں

اس لمحۂ خوشی میں افسانۂ شبِ غم
کچھ تم بھی بھولتے ہو کچھ میں بھی بھولتا ہوں

☼

تاروں کی چلمنوں سے کوئی جھانکتا بھی ہو
اس کائنات میں کوئی منظر نیا بھی ہو

اتنی سیاہ رات میں کس کو صدائیں دوں
ایسا چراغ دے جو کبھی بولتا بھی ہو

درویش کوئی آئے تو آرام سے رہے
گھر بھی ترے فقیر کا اتنا بڑا تو ہو

سارے پہاڑ کاٹ کے میں ملنے آؤں گا
ہاں میرے انتظار میں دریا رکا بھی ہو

رنگوں کی کیا بہار ہے پتھر کے باغ میں
لیکن مری زمیں کا اِک حصہ ہرا بھی ہو

جگنو کوئی ستاروں کی محفل میں کھو گیا
اتنا نہ کر ملال جو ہونا تھا ہوگیا

پروردگار جانتا ہے تو دِلوں کا حال
میں جی نہ پاؤں گا جو اسے کچھ بھی ہوگیا

اب اس کو دیکھ کر نہیں دھڑکے گا میرا دل
کہنا کہ مجھ کو یہ بھی سبق یاد ہوگیا

بادل اُٹھا تھا سب کو رُلانے کے واسطے
آنچل بھگو گیا کہیں دامن بھگو گیا

اِک لڑکی، ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اُجلی دُھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

سورج بھی بندھا ہوگا دیکھو مرے بازو میں
اس چاند کو بھی رکھنا سونے کے ترازو میں

اب ہم سے شرافت کی اُمید نہ کر دینا
پانی نہیں مل سکتا تپتی ہوئی بالو میں

تاریک سمندر کے سینے میں گہر ڈھونڈو
جگنو بھی چمکتے ہیں برسات کے آنسو میں

سب دیر و حرم جھوٹے دلدار و صنم جھوٹے
ہم آ ہی گئے دُنیا آخر تیرے جادو میں

خوابیدہ گلابوں پر یہ اوس بچھی کیسے
احساس چمکتا ہے اُسلوب کی، خوشبو میں

☼

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی
زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی

میری مٹھی میں سوکھے ہوئے پھول ہیں
خوشبوؤں کو اُڑا کر ہوا لے گئی

میں سمندر کے سینے میں چٹان تھا
رات اِک موج آئی بہا لے گئی

ہم تو کاغد تھے اشکوں سے بھیگے ہوئے
کیوں چراغوں کو لُوتک ہوا لے گئی

چاند نے رات مجھ کو جگا کر کہا
ایک لڑکی تمھارا پتہ لے گئی

گاؤں چھوڑا تو کئی آنکھوں میں کاجل پھیلا
شہر پہنچا تو کسی ماتھے پہ جھومر جھوما

زندگی تو نے مجھے مار لیا تھا لیکن
یہ تو میں تھا کہ ترے زندوں سے بہتر ہی جیا

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

وہ تو انساں تھی تری یاد کی محویت میں
درودیوار کو سینے سے لگا کر چوما

آج کی شام دوبارہ نہ کبھی آئے گی
آج کی شام یہ مت سوچ کہ کل کیا ہوگا

دُکھ بھرا پیار سمندر کی طرح لامحدود
غمزدہ حسن، رواں پانی میں گھلتا سونا

میرے ہاتھوں سے کبھی چھوٹا تھا اِک آئینہ
عمر بھر جس کو مری آنکھوں نے پلکوں سے چنا

رات خاموشیِ دل چھا گئی جب دُنیا پر
کوئی بولا تھا بہت پاس وہ تم تھے کہ خدا

خوب صورت ہے بہت پیار کی خوش فہمی بھی
بند پلکوں کو تیرے ہونٹوں نے جیسے چوما

☼

وہ پیاسے جھونکے بہت پیاسے لوٹ جاتے ہیں
جو دُور دُور سے بادل اُڑا کے لاتے ہیں

کوئی لباس نہیں دل کی بے لباسی کا
اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

ستارہ بن کے بھٹکتے ہیں ساری ساری رات
جو وعدہ کرکے وفا کرنا بھول جاتے ہیں

تیرا سکوت بھی اکثر تحیرِ نغمہ
خموش رہ کے بھی یہ ہونٹ گنگناتے ہیں

میں دن ہوں میری جبیں پر دُکھوں کا سورج ہے
دیے تو رات کے پلکوں پر جھلملاتے ہیں

گلاب سا وہ بدن کیا ہوائے درد میں تو
گھنے درخت کے جنگل بھی سوکھ جاتے ہیں

خوشا یہ قدر تو ہے اس اُداس نسل کے پاس
اُداس بھی جو نہ ہوں گے وہ لوگ آتے ہیں

☼

خفتہ شجر لرز اُٹھے جیسے کہ ڈر گئے
کچھ چاندنی کے پھول زمین پر بکھر گئے

شیشے کا تاج سر پہ رکھے آرہی تھی رات
ٹکرائی ہم سے چاند ستارے بکھر گئے

وہ خشک ہونٹ، ریت سے نم مانگتے رہے
جس کی تلاش میں کئی دریا گزر گئے

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں
ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے

میرے لبوں پہ چاند کی قاشیں لرز گئیں
آنکھوں پہ جیسے رات کے گیسو بکھر گئے

تلووں میں نرم دُھوپ نے جب گدگدی سی کی
پلکوں پہ سوئے چاندنی کے خواب ڈر گئے

ساحل پہ رُک گئے تھے ذرا دیر کے لیے
آنکھوں سے دل میں کتنے سمندر اُتر گئے

جن پر لکھی ہوئی تھی محبت کی داستاں
وہ چاک چاک پُرزے ہوا میں بکھر گئے

پایا جو مسکراتے ہوئے کہہ اُٹھی بہار
جو زخم پچھلے سال لگائے تھے بھر گئے

جن پر لکھی ہوئی تھی محبت کی داستان
وہ چاک چاک پرزے ہوا میں بکھر گئے

☼

سورج مکھی کے گالوں پہ تازہ گلاب ہے
یہ میرا آفتاب ، مرا ماہتاب ہے

ہر تارہ ، کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی دُعا
یہ آسمان ، حمد و ثنا کی کتاب ہے

بادل ہوا کی زد پہ برس کر بکھر گئے
اپنی جگہ چمکتا ہوا آفتاب ہے

چونکے تو یہ طلسمِ جہاں ٹوٹ جائے گا
عالم تمام حلقۂ زنجیرِ خواب ہے

ناحق خیال کرتے ہو دُنیا کی بات کا
تم کو خراب جو کہے وہ خود خراب ہے

سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں برگِ بہار کے
اُڑنا ہوا کے دوش پہ کیسا عذاب ہے

☼

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

اِک ذہنِ پریشان میں خوابِ غزلستاں ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے

دل سے جو چھٹے بادل تو آنکھ میں ساون ہے
ٹھہرا ہوا دریا ہے بہتا ہوا پانی ہے

اے پیرِ خردمنداں دل کی بھی ضرورت ہے
یہ شہرِ غزالاں ہے یہ ملکِ جوانی ہے

غم وجہِ فگارِ دل غم وجہِ قرارِ دل
آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے

اس حوصلۂ دل پہ ہم نے بھی کفن پہنا
ہنس کر کوئی پوچھے گا کیا جان گنوانی ہے

دن تلخ حقائق کے صحراؤں کا سورج ہے
شب گیسو افسانہ یادوں کی کہانی ہے

وہ مصرعِ آوارہ دیوانوں پہ بھاری ہے
جس میں تیرے گیسو کی بے ربط کہانی ہے

☼

ہمارے واسطے یہ چار دن کی شہرت کیا
وہ مل گیا تو کسی اور کی ضرورت کیا

کبھی کبھی تو محبت کا احترام کرو
وہ بے وفا ہے تو پھر بے وفا کی چاہت کیا

گلاب کس لیے لب کو سجائے سرخی سے
ہرن کی آنکھ میں کاجل کی ہے ضرورت کیا

خدایا میری صدی میں بھی معجزہ کردے
وہ پوچھتے ہیں کہ اس دَور میں محبت کیا

میں اپنی خاک اٹھا کر کہاں کہاں ڈولوں
ترے بغیر مری زندگی کی قیمت کیا

☼

دماغ بھی کوئی مصروف چھاپہ خانہ ہے
وہ شور، جیسے کہ اخبار چھپتا رہتا ہے

ہزاروں پتّے زمین پر شہید ملتے ہیں
خزاں کی دھوپ میں نیزہ کوئی چمکتا ہے

زمیں نے مانگ لیا آسماں نے چھین لیا
ہمارے پاس نہ اب جسم ہے نہ سایا ہے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رُک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارے جیسا ہے

جہاں پہ ملتی تھیں دو کرنیں اس شجر کے تلے
دلائی اوڑھے ہوئے اِک فقیر بیٹھا ہے

☼

شعلۂ گل، گلاب شعلہ کیا
آگ اور پھول کا یہ رشتہ کیا

تم مری زندگی ہو یہ سچ ہے
زندگی کا مگر بھروسہ کیا

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امیں
کوئی سمجھے بساط لہجہ کیا

جو نہ آدابِ دشمنی جانے
دوستی کا اسے سلیقہ کیا

جب کمر باندھ لی سفر کے لیے
دھوپ کیا مینھ کیا ہے سایہ کیا

سب ہیں کردار اک کہانی کے
ورنہ شیطان کیا فرشتہ کیا

جان کر ہم بشیر بدؔر ہوئے
اس میں تقدیر کا نوشتہ کیا

خوشبو کی طرح آیا وہ تیز ہواؤں میں
مانگا تھا جسے ہم نے دن رات دُعاؤں میں

تم چھت پہ نہیں آئے میں گھر سے نہیں نکلا
یہ چاند بہت بھٹکا ساون کی گھٹاؤں میں

اس شہر میں اِک لڑکی بالکل ہے غزل جیسی
بجلی سی گھٹاؤں میں خوشبو سی ہواؤں میں

موسم کا اشارہ ہے خوش رہنے دو بچوں کو
معصوم محبت ہے پھولوں کی خطاؤں میں

ہم چاند ستاروں کی راہوں کے مسافر ہیں
ہر رات چمکتے ہیں تاریک خلاؤں میں

بھگوان ہی بھیجیں گے چاول سے بھری تھالی
مظلوم پرندوں کی معصوم سبھاؤں میں

دادا بڑے بھولے تھے سب سے یہ ہی کہتے تھے
کچھ زہر بھی ہوتا ہے انگریزی دواؤں میں

☼

ہمہ وقت رنج و ملال کیا جو گزر گیا سو گزر گیا
اسے یاد کر کے نہ دل دکھا جو گزر گیا سو گزر گیا

نہ گلہ کیا ، نہ خفا ہوئے یونہی راستے میں جدا ہوئے
نہ تو بے وفا نہ میں بے وفا ، جو گزر گیا سو گزر گیا

وہ غزل کی ایک کتاب تھا وہ گلوں میں ایک گلاب تھا
ذرا دیر کا کوئی خواب تھا جو گزر گیا سو گزر گیا

مجھے پت جھڑوں کی کہانیاں نہ سنا سنا کے اُداس کر
تو خزاں کا پھول ہے مسکرا جو گزر گیا سو گزر گیا

وہ اُداس دُھوپ سمیٹ کر کہیں وادیوں میں اُتر چکا
اسے اب نہ دے مرے دل صدا جو گزر گیا سو گزر گیا

یہ سفر بھی کتنا طویل ہے یہاں وقت کتنا قلیل ہے
کہاں لوٹ کر کوئی آئے گا جو گزر گیا سو گزر گیا

وہ وفائیں تھیں کہ جفائیں تھیں نہ یہ سوچ کس کی خطائیں تھیں
وہ ترا ہے اس کو گلے لگا جو گزر گیا سو گزر گیا

کوئی فرقِ شاہ و گدا نہیں کہ یہاں کسی کی بقا نہیں
یہ اُجاڑ محلوں کی سن صدا ، جو گزر گیا سو گزر گیا

تجھے اعتبار و یقیں نہیں ، نہیں دنیا اتنی بری نہیں
نہ ملال کر مرے ساتھ آ جو گزر گیا سو گزر گیا

☼

شیشہ بھی آج سرمد و منصور ہوگیا
آئینہ تجھ کو دیکھ کے مغرور ہوگیا

کاغذ میں دَب کے مر گئے کیڑے کتاب کے
دیوانہ بے پڑھے لکھے مشہور ہوگیا

محلوں میں ہم نے کتنے ستارے سجا دیے
لیکن زمین سے چاند بہت دُور ہوگیا

تنہائیوں نے توڑ دی ہم دونوں کی اَنا
آئینہ بات کرنے پہ مجبور ہوگیا

دادی سے کہنا اس کی کہانی سنائیے
وہ بادشاہ جو عشق میں مزدور ہوگیا

صبحِ وصال پوچھ رہی ہے عجب سوال
وہ پاس آگیا کہ بہت دُور ہوگیا

کچھ پھل ضرور آئیں گے روٹی کے پیڑ میں
جس دن مرا مطالبہ منظور ہوگیا

آہن میں ڈھلتی جائے گی اکیسویں صدی
پھر بھی غزل سنائے گی اکیسویں صدی

بغداد ، دلّی ، ماسکو ، لندن کے درمیان
بارود بھی بچھائے گی اکیسویں صدی

جل کر جو راکھ ہوگئیں دنگوں میں اس برس
ان جھگیوں میں آئے گی اکیسویں صدی

اِک یاترا ضروری ہے ننانوے کے پاس
رَتھ پر سوار آئے گی اکیسویں صدی

تہذیب کے لباس اُتر جائیں گے جناب
ڈالر میں گنگنائے گی اکیسویں صدی

لے جاکے آسمان پہ تاروں کے آس پاس
اُمریکہ کو گرائے گی اکیسویں صدی

پھر سے خدا بنائے گا کوئی نیا جہاں
دنیا کو یوں مٹائے گی اکیسویں صدی

کمپیوٹروں سے غزلیں لکھیں گے بشیر بدؔر
غالبؔ کو بھول جائے گی اکیسویں صدی

"آس" کے بعد کی غزلیں

☼

آنکھوں کو آنسوؤں نے کبھی یوں سجا دیا
پلکوں کو جگنوؤں کا جھروکہ بنا دیا

لہروں میں ایک دن تری تصویر آئے گی
کاغذ کو آج ہم نے ندی میں بہا دیا

میں شاخ پر مہکتا ہوا اِک گلاب تھا
یہ کس کی بد دُعاؤں نے پتھر بنا دیا

میں طاق کا دیا نہیں جنگل کی آگ ہوں
جا، پت جھڑوں کا نام و نشاں مٹا دیا

میں چاند کا خیال تھا تاروں کا خواب تھا
کس نے مجھے چراغ بنا کر بجھا دیا

اب صبح کی اذان مرا منہ دُھلائے گی
بے خواب سسکیوں نے تھپک کر سُلا دیا

☼

اُداس چاند ستاروں کو ہم نے چھوڑ دیا
ہوا کے ساتھ چلے اور ہوا کو موڑ دیا

اس آسمان کو ہم نے زمین بخشی ہے
زمین سخت تھی ، دل کا لہو نچوڑ دیا

وہ جانتا ہے ، اکیلا کہاں میں جاؤں گا
اسی لیے تو مرا ہاتھ اس نے چھوڑ دیا

ذرا اُداس ہے دنیا ، بہت خراب ہے دل
تمھاری یاد نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا

ہزار سال کا قصّہ تمام کر ڈالا
زمیں کا ایک ورق آسماں نے جوڑ دیا

تمام زندگی ہم نے غزل کے نام لکھی
ہر ایک فیصلہ ہم نے خدا پہ چھوڑ دیا

☼

رات آنکھوں میں ڈھلی پلکوں پہ جگنو آئے
ہم ہواؤں کی طرح جاگے اُسے چھو آئے

میرا آئینہ بھی اب میری طرح پاگل ہے
آئینہ دیکھنے جاؤں تو نظر تو آئے

ان فقیروں کو غزل اپنی سناتے رہیو
جن کی آواز میں درگاہوں کی خوشبو آئے

بس گئی ہے مرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے

اُس کی آنکھیں مجھے میؔرا کا بھجن لگتی ہیں
پلکیں جھپکائے تو لوبان کی خوشبو آئے

کس تکلف سے گلے ملنے کا موسم آیا
پھول کاغذ کے لیے کانچ کے بازو آئے

خوبصورت سی ایڈیٹر کی یہ فرمائش ہے
اِک غزل ایسی کہ اخبار سے خوشبو آئے

زندگی موسموں کی ہجرت ہے
دل کا پت جھڑ بھی خوبصورت ہے

چاند میں اِک اُداس لڑکی ہے
اُس کے میری خط و کتابت ہے

اُجلے اُجلے چراغ پہنے ہوئے
رات اِک سانولی سی عورت ہے

دُھوپ بالوں میں جھلملانے لگی
آئینہ کتنا بے مروّت ہے

دن میں یہ ہم سے بھی گیا گزرا
رات میں چاند خوبصورت ہے

آدمی آج تک ادھورا ہے
ایک عورت ، ہزار عورت ہے

اِس کے چاروں طرف سمندر ہے
دل بڑی خوشنما عمارت ہے

بام و در سے گھروں کے آنگن تک
دُھوپ کی خودغرض سیاست ہے

کیا یہاں آدمی نہیں رہتے
آپ کا شہر بہت خوبصورت ہے

صبح سورج کے ساتھ سولیں گے
رات بھر جاگنا عبادت ہے

☼

چل چل کے رُکے، رُک رُک کے چلے جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا
سب کی مانی پر شام ڈھلے جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

پھل پھول رکھیں ان قدموں پر جو سورج کے گھر جاتے ہیں
یہ بات کبھی اُتری نہ گلے ، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

موسم کے دین و مذہب کو ہم نے اپنا مذہب جانا
پھولوں کے بدن پھولوں سے ملے ، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

روشن روشن شاخوں پہ کھلے ، جب شام ڈھلی طاقوں میں جلے
موتی چمکے پلکوں کے تلے ، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

مٹکی ، ماکھن ، گاگر ، چھن چھن ، رِم جھم رِم جھم برسے ساون
سندر سندر گودوں میں پلے ، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

☼

تھرٹی فائیو ہے بہت بھرپور عورت سی لگی
اس سے مل کر زندگی کچھ خوبصورت سی لگی

دُھوپ کے سادھو کو کس نے پیار سے پانی دیا
صبح کی پوجا مجھے شب کی عبادت سی لگی

پھول سی بچّی نے میرے ہاتھ سے چھینا گلاس
آج امّی کی طرح وہ پوری عورت سی لگی

آخری بیٹی کی شادی کر کے سوئی رات بھر
صبح بچّوں کی طرح وہ خوبصورت سی لگی

تم نے گھر آ کر در و دیوار روشن کر دیے
گود میں چھکا فرشتہ دُھوپ جنت سی لگی

کچھ دِنوں کے بعد اس نے بھی ضرورت اوڑھ لی
کوئی لڑکی جب نئی آئی قیامت سی لگی

لان کی ناراضگی ، یہ شام کی پرچھائیاں
آج آنگن کی خموشی بھی شکایت سی لگی

چاند کے ماتھے پہ بل پلکوں تلے جھلمل چراغ
اس کی نفرت بھی مجھے کل شب محبت سی لگی

سب مغل دربار کی پوشاک پہنے ہیں فقیر
شعر کی تنقید قبروں کی تجارت سی لگی

باوضو شاخوں پہ سوئی تھی پرندوں کی اذاں
رات بارش بھی مجھے صبح عبادت سی لگی

وہ بڑی سی کار سے اُتری سیاست کی طرح
اِک طوائف آج مجھ کو اپنی شہرت سی لگی

روٹیاں کچی پکیں کپڑے بہت گندے دُھلے
مجھ کو پاکستان کی اس میں شرارت سی لگی

☼

خوش رہے یا بہت اُداس رہے
زندگی تیرے آس پاس رہے

اِک پرندہ اُداس بیٹھا تھا
شام کے سائے آس پاس رہے

زندگی بھی عجیب دریا ہے
زندگی بھر اسی کی پیاس رہے

رات کے بعد رات آئے گی
ہاتھ میں چاند کا گلاس رہے

جب بھی کسنے لگا اُتار دیا
اس بدن پر کئی لباس رہے

زندگی کے لیے ضروری ہے
ہر حقیقت تلے قیاس رہے

اس زمیں پر کئی خزانے ہیں
اس زمیں پر ذرا سی گھاس رہے

آج ہم سب کے ساتھ خوب ہنسے
اور پھر دیر تک اُداس رہے

اِک ستارے کے انتظار میں گم
شاخ پر پھول بدحواس رہے

وہ نہیں ہے تو اُس کی آس رہے
ایک جائے تو ایک پاس رہے

ایک دن میں اگر لہو پی لوں
سات دن برتنوں میں باس رہے

دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھیں
آئینہ آئینے کے پاس رہے

گھل گئے اپنی بدنصیبی میں
جو ستارے ہمارے پاس رہے

☼

جگنو جگنو ، خوشبو خوشبو ، شام ہوا کا نام
دھرتی اَمبر ، نیچے اوپر ایک ذرا سا نام

پتھر کی دہلیز سے جھانکی اِک خوشبو سی کونپل
رِم جھم رِم جھم برس رہا ہے پاک خدا سا نام

پہلی بار ہوا کل تیری خوشبو کا احساس
ننھے مُنّے ہونٹوں پر تھا رات دعا سا نام

اتنی محبت اتنی شہرت کاغذ کاروبار
کرنوں جیسا کام ہمارا سورج جیسا نام

اس دنیا کی شہرت کیا ہے اِک تصویر بنائیں
گھر گھر روٹی مانگ رہا ہے آج بڑا سا نام

☼

وہ شاخ ہے نہ پھول اگر تتلیاں نہ ہوں
وہ گھر بھی کوئی گھر ہے جہاں بچّیاں نہ ہوں

پلکوں سے آنسوؤں کی مہک آنی چاہیے
خالی ہے آسمان اگر بدلیاں نہ ہوں

دشمن کو بھی خدا کبھی ایسا مکاں نہ دے
تازہ ہوا کی جس میں کہیں کھڑکیاں نہ ہوں

میں پوچھتا ہوں میری گلی میں وہ آئے کیوں
جس ڈاکیے کے پاس تری چٹھیاں نہ ہوں

اچھی آنکھیں سچّے دل پوجا کریں
آ صنم خانوں میں ہم سجدہ کریں

پھول جیسے خوبصورت زخم ہیں
زندگی سے کیا گلہ شکوہ کریں

جب وہ آئے گا زمانہ آئے گا
ہم اکیلے ہیں اکیلے کیا کریں

آؤ جاناں بادلوں کے ساتھ ساتھ
دُھوپ جاتی ہے کہاں پیچھا کریں

پلکوں پلکوں رات بھر شبنم چنیں
قطرہ قطرہ جوڑ کر دریا کریں

دُور جائیں دُور سے باتیں کریں
پاس آئیں پاس سے دیکھا کریں

یہ مزہ لینے کا موسم پھر کہاں؟
رحمتوں کی رات ہے سجدہ کریں

اسی خاک میں بسوں گا یہی فیصلہ کیا ہے
اس خاک سے اُٹھوں گا یہی فیصلہ کیا ہے

بڑا دلفریب ہوگا یہاں پت جھڑوں کا موسم
کسی شاخ پر کھلوں گا یہی فیصلہ کیا ہے

وہ ہوا ضرور آئے، مری رات ساتھ لائے
میں چراغ ہوں جلوں گا یہی فیصلہ کیا ہے

سرِ شام تیرے آنسو جو ذرا جھلک پڑیں گے
انھیں رات بھر چنوں گا یہی فیصلہ کیا ہے

تو بہت دہک رہا ہے تو بہت چہک رہا ہے
ترے ہونٹ چوم لوں گا یہی فیصلہ کیا ہے

تری دوستی کے صدقے تری دشمنی پہ قرباں
میں یہیں جیوں مروں گا یہی فیصلہ کیا ہے

☼

ایک اچھی لڑکی تھی ہم بھی اسے اچھے لگے
دیر تک لیکن کہاں چلتے ہیں ایسے سلسلے

وہ بھی کیا بھرپور دن تھے یاد آتے ہیں بہت
آگ اوڑھی اور بچھائی پانیوں پر ہم چلے

کچھ دنوں کے بعد پیپل کی طرح پوجیں گے لوگ
ہم کھڑے ہیں اور گزرے جا رہے ہیں قافلے

آنے والے آئیں گے اور جانے والے جائیں گے
خوبصورت ہیں بہت آواگون کے سلسلے

☼

دارُو سے انکار کرے گا، چل جھوٹے
تو بچّوں سے پیار کرے گا، چل جھوٹے

چھیّاں چھیّاں چلّو چلّو پانی پی
دل کا دریا پار کرے گا، چل جھوٹے

دوہے میں غزلوں کی لٹکن ٹھیک نہیں
لنگی کو شلوار کرے گا، چل جھوٹے

دل کو اب تیزاب سے دھونا پڑتا ہے
گنگا جل بیکار کرے گا، چل جھوٹے

مکتب مکتب کاغذ کے رٹّو طوطے
منصب سے انکار کرے گا، چل جھوٹے

مندر مسجد کا جھگڑا، حلوہ پوری
پوجا دُنیادار کرے گا، چل جھوٹے

میؔر، نظیؔر، کبیؔر، بشیؔر کے جلوے ہیں
غالبؔ کیا دربار کرے گا، چل جھوٹے

☼

آگ لہرا کے چلی ہے اسے آنچل کر دو
تم مجھے رات کا جلتا ہوا جنگل کر دو

چاند سا مصرعہ اکیلا ہے مرے کاغذ پر
چھت پہ آجاؤ مرا شعر مکمل کر دو

میں تمھیں دل کی سیاست کا ہنر دیتا ہوں
اب اسے دُھوپ بنادو مجھے بادل کر دو

اپنے آنگن کی اُداسی سے ذرا بات کرو
نیم کے سوکھے ہوئے پیڑ کو صندل کر دو

تم مجھے چھوڑ کے جاؤ گے تو مر جاؤں گا
یوں کرو جانے سے پہلے مجھے پاگل کر دو

☼

پرکھنا مت ، پرکھنے میں کوئی اپنا نہیں رہتا
کسی بھی آئینے میں دیر تک چہرہ نہیں رہتا

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا دریا نہیں رہتا

ہزاروں شعر میرے سو گئے کاغذ کی قبروں میں
عجب ماں ہوں کوئی بچّہ مرا زندہ نہیں رہتا

محبت ایک خوشبو ہے ، ہمیشہ ساتھ چلتی ہے
کوئی انسان تنہائی میں بھی تنہا نہیں رہتا

کوئی بادل ہرے موسم کا پھر اعلان کرتا ہے
خزاں کے باغ میں جب ایک بھی پتّا نہیں رہتا

تمھارا شہر تو بالکل نئے انداز والا ہے
ہمارے شہر میں بھی اب کوئی ہم سا نہیں رہتا

☼

سات رنگوں کے شامیانے ہیں
دل کے موسم بڑے سہانے ہیں

کوئی تدبیر بھولنے کی نہیں
یاد آنے کے سو بہانے ہیں

دل کی بستی ابھی کہاں بدلی
یہ محلّے بہت پرانے ہیں

حق ہمارا نہیں درختوں پر
یہ پرندوں کے آشیانے ہیں

علم و حکمت ، سیاست و مذہب
اپنے اپنے شراب خانے ہیں

دُھوپ کا پیار خوبصورت ہے
آگ کے پھول بھی سہانے ہیں

کتابیں، رسالے نہ اخبار پڑھنا
مگر دل کو ہر رات اِک بار پڑھنا

سیاست کی اپنی الگ اِک زباں ہے
لکھا ہو جو اقرار، انکار پڑھنا

علامت نئے شہر کی ہے سلامت
ہزاروں برس کی یہ دیوار پڑھنا

کتابیں، کتابیں، کتابیں، کتابیں
کبھی تو وہ آنکھیں وہ رخسار پڑھنا

میں کاغذ کی تقدیر پہچانتا ہوں
سپاہی کو آتا ہے تلوار پڑھنا

بڑی پُرسکوں دُھوپ جیسی وہ آنکھیں
کسی شام جھیلوں کے اُس پار پڑھنا

زبانوں کی یہ خوبصورت اکائی
غزل کے پرندوں کا اشعار پڑھنا

☼

نام اُسی کا نام سویرے شام لکھا
شعر لکھا یا خط اُس کو گمنام لکھا

اُس دن پہلا پھول کھلا جب پت جھڑ نے
پتّی پتّی جوڑ کے تیرا نام لکھا

اُس بچّے کی کاپی اکثر پڑھتا ہوں
سورج کے ماتھے پر جس نے شام لکھا

کیسے دونوں وقت گلے ملتے ہیں روز
یہ منظر میں نے دُشمن کے نام لکھا

سات زمینیں ، ایک ستارہ نیا نیا
صدیوں بعد غزل نے کوئی نام لکھا

میؔر ، کبیؔر ، بشیؔر ، اِسی مکتب کے ہیں
آ دل کے مکتب میں اپنا نام لکھا

☼

صدیوں کی گٹھری سر پر لے جاتی ہے
دُنیا بچّی بن کر واپس آتی ہے

میں دُنیا کی حد سے باہر رہتا ہوں
گھر میرا چھوٹا ہے لیکن ذاتی ہے

دُنیا بھر کے شہروں کا کلچر یکساں
آبادی ، تنہائی بنتی جاتی ہے

میں شیشے کے گھر میں پتھر کی مچھلی
دریا کی خوشبو مجھ میں کیوں آتی ہے

پتھر بدلا ، پانی بدلا ، بدلا کیا؟
انساں تو جذباتی تھا جذباتی ہے

کاغذ کی کشتی ، جگنو جھلمل جھلمل
شہرت کیا ہے اِک ندیا برساتی ہے

☼

غموں کی آہٹیں شب بھر چھتوں پہ چلتی ہیں
امام باڑوں سے سیدانیاں نکلتی ہیں

اُداسیوں کو سدا دل کے طاق میں رکھنا
یہ موم بتّیاں ہیں ، رات رات جلتی ہیں

رسوئی گھر میں یہ احساس روز ہوتا ہے
تری دعاؤں کے پنکھے ہوائیں جھلتی ہیں

عجیب آگ ہے ہمدردیوں کے موسم کی
غریب بستیاں برسات ہی میں جلتی ہیں

یہ اُلجھنیں بھی ضروری ہیں زندگی کے لیے
سمندروں میں یونہی مچھلیاں مچلتی ہیں

☼

دُھوپ کے پار ستاروں کا نگر لگتا ہے
اُس پہاڑی پہ مجھے چاند کا گھر لگتا ہے

سر سے پا تک وہ گلابوں کا شجر لگتا ہے
باوضو ہو کے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

چاند محراب پہ سوئی ہوئی اِک آیت ہے
بے وضو آنکھیں ہیں پڑھتے ہوئے ڈر لگتا ہے

میں ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

ایسا لگتا ہے کوئی سانپ چھپا بیٹھا ہو
پھول سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

مجھ میں رہتا ہے کوئی دشمنِ جانی میرا
خود سے تنہائی میں ملتے ہوئے ڈر لگتا ہے

بت بھی رکھے ہیں نمازیں بھی ادا ہوتی ہیں
دل مرا دل نہیں ، اللہ کا گھر لگتا ہے

☼

شام سے راستہ تکتا ہوگا
چاند کھڑکی میں اکیلا ہوگا

دھوپ کی شاخ پہ تنہا تنہا
وہ محبت کا پرندہ ہوگا

نیند میں ڈوبی مہکتی سانسیں
خواب میں پھول سا چہرہ ہوگا

مسکراتا ہوا جھلمل آنسو
تیری رحمت کا فرشتہ ہوگا

خوبصورت نئی دُنیا ہوگی
مجھ سے اچھا مرا بیٹا ہوگا

درد کی بستیاں بسا کے رکھو
رحمتوں کو سجا سجا کے رکھو

کاغذوں کے گھروں سے دور ذرا
دل کی چنگاریاں دبا کے رکھو

آگ کے جھلملاتے پھولوں سے
دل کا موسم سجا سجا کے رکھو

آخری وقت مسکرانا ہے
یہ ہنر ہے اِسے بچا کے رکھو

☼

عبادتوں کی طرح میں یہ کام کرتا ہوں
مرا اصول ہے پہلے سلام کرتا ہوں

مخالفت سے مری شخصیت سنورتی ہے
میں دشمنوں کا بڑا احترام کرتا ہوں

میں اپنی جیب میں اپنا پتہ نہیں رکھتا
سفر میں صرف یہ ہی اہتمام کرتا ہوں

میں ڈر گیا ہوں بہت سایہ دار پیڑوں سے
ذرا سی دھوپ بچھا کر قیام کرتا ہوں

مجھے خدا نے غزل کا دیار بخشا ہے
یہ سلطنت میں محبت کے نام کرتا ہوں

☼

غم ہمیشہ خوبصورت دیجیے
ہم محبت ہیں، محبت دیجیے

اَن چھوئی کلیوں کی پلکیں چومیے
اجنبی بچوں کو چاہت دیجیے

جھیل سی آنکھوں میں پورے چاند کو
ڈوب جانے کی اجازت دیجیے

اِن پرندوں پر بھروسہ کیجیے
آسماں چھونے کی ہمت دیجیے

آپ سے مل کر بہت جی خوش ہوا
پھر ملیں گے اب اجازت دیجیے

☼

دالانوں کی دھوپ، چھتوں کی شام کہاں
گھر سے باہر گھر جیسا آرام کہاں

میں اس کو پہچان نہیں پایا تو کیا
یاد اُسے بھی آیا میرا نام کہاں

چندا کے بستے میں سوکھی روٹی ہے
کاجو، کشمش، پستے اور بادام کہاں

لوگوں کو سورج کا دھوکا ہوتا ہے
آنسو بن کر چمکا میرا نام کہاں

دن بھر سورج کس کا پیچھا کرتا ہے
روز پہاڑی پر جاتی ہے شام کہاں

☼

تری جنت سے ہجرت کر رہے ہیں
فرشتے کیا بغاوت کر رہے ہیں

وہ خود ہارے ہوئے ہیں زندگی سے
جو دُنیا پر حکومت کر رہے ہیں

زمیں بھیگی ہوئی ہے آنسوؤں سے
یہاں بادل عبادت کر رہے ہیں

فضا میں آہٹیں مہکتی ہوئی ہیں
کہیں بچّے تلاوت کر رہے ہیں

ہماری بے بسی کی انتہا ہے
کہ ظالم کی حمایت کر رہے ہیں

میں اپنے بھائیوں سے مختلف ہوں
وہ موسم کی شکایت کر رہے ہیں

مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے
یہ دُنیا خوبصورت ہو گئی ہے

خدا سے روز تم کو مانگتا ہوں
مری چاہت، عبادت ہو گئی ہے

وہ چہرہ چاند ہے آنکھیں ستارے
زمیں پھولوں کی جنت ہو گئی ہے

بہت دن سے تمھیں دیکھا نہیں ہے
چلے بھی آؤ، مدت ہو گئی ہے

☼

سن لی خدا نے وہ دعا تم تو نہیں ہو
دروازے پہ دستک کی صدا، تم تو نہیں ہو

محسوس کیا تم کو تو گیلی ہوئی پلکیں
بھیگے ہوئے موسم کی ادا تم تو نہیں ہو

انجانی سی راہوں میں کوئی بھی نہیں میرا
کس نے مجھے یوں اپنا کہا، تم تو نہیں ہو

دُنیا کو بہرحال گلے شکوے رہیں گے
دُنیا کی طرح مجھ سے خفا تم تو نہیں ہو

☼

اِک چہرہ ساتھ ساتھ رہا جو ملا نہیں
کس کو تلاش کرتے رہے کچھ پتہ نہیں

شدّت کی دھوپ، تیز ہواؤں کے باوجود
میں شاخ سے گرا ہوں، نظر سے گرا نہیں

آخر غزل کا تاج محل بھی ہے مقبرہ
ہم زندگی تھے ہم کو کسی نے جیا نہیں

جس کی مخالفت ہوئی مشہور ہوگیا
ان پتھروں سے کوئی پرندہ گرا نہیں

تاریکیوں میں اور چمکتی ہے دل کی دھوپ
سورج تمام رات یہاں ڈوبتا نہیں

کس نے جلائیں بستیاں، بازار کیوں لٹے
میں چاند پر گیا تھا، مجھے کچھ پتہ نہیں

☼

آگ کو گلزار کرے، برف کو دریا کرے
دیکھنے والا تری آواز کو دیکھا کرے

اُس کی رحمت نے مرے بچّے کے ماتھے پر لکھا
اس پرندے کے پروں پر آسماں سجدہ کرے

ایک مٹھی خاک تھے ہم، ایک مٹھی خاک ہیں
اس کی مرضی ہے ہمیں صحرا کرے، دریا کرے

دن کا شہزادہ مرا مہمان ہے، بیشک رہے
رات کا بھولا مسافر بھی یہاں ٹھہرا کرے

☼

آئینہ دھوپ کا ، دریا میں دِکھاتا ہے مجھے
میرا دشمن ، مرے لہجے میں بلاتا ہے مجھے

آنسوؤں سے مری تحریر نہیں مٹ سکتی
کوئی کاغذ ہوں کہ پانی سے ڈراتا ہے مجھے

سر پہ سورج کی سواری مجھے منظور نہیں
اپنا قد دھوپ میں چھوٹا نظر آتا ہے مجھے

دودھ پیتے ہوئے بچّے کی طرح ہے دل بھی
دن میں سو جاتا ہے راتوں میں جگاتا ہے مجھے

روز کہتا ہے کہ گرتی ہوئی دیوار ہو تم
ایک بادل ہے جو رہ رہ کے ڈراتا ہے مجھے

متفرق اشعار

ہم شریفوں کی ذرا مجبوریاں سمجھا کرو
جس کو اچھا کہہ دیا اُس کو بُرا کیسے کہیں

محفوظ ہے لہو میں شرافت کی چاندنی
دل بے وفا ہزار ہو میں بے وفا نہیں

اگر انساں سے ملنا ہو تو لہجے میں سیاست رکھ
شرافت سے خدا مل جائے گا انساں نہیں ملتے

دُنیا کے ساتھ ساتھ ہوں دُنیا کو چھوڑ کر
یہ نوٹ رکھ لیا ہے لفافے میں موڑ کر

ہزاروں شبد جو اخبار میں پتھر کے ہوتے ہیں
غزل میں آگئے تو رات کی پلکیں بھگوتے ہیں

ہندو بنو تو متھرا، مسلم بنو تو مکّہ
انساں اگر رہو تو سارا جہاں تمھارا

تنہا تنہا پھول اکیلا جنگل میں
یہ بچہ بے باپ کا بچہ لگتا ہے

ایمان کر گیا کبھی سمّان کر گیا
جھونکا ہوا کا دھول کو انسان کر گیا

خوبصورت سا وہ زمانہ تھا
میرے کمرے میں دھوپ آتی تھی

زندگی خوشنما ریاست ہے
دل کا سلطان خوبصورت ہے

پلکوں پہ زرد زرد ستاروں کے پھول ہیں
آنسو نہیں ہیں دل کی مزاروں کے پھول ہیں

حقیقت ہی حقیقت ہے کہانی کون سنتا ہے
نئی سنتی نہیں دُنیا، پرانی کون سنتا ہے

لہروں پہ ایک دن تیری تصویر آئے گی
کاغذ کو آج ہم نے ندی میں بہا دیا

لکھوری اینٹوں والی وہ حویلی سوگئی بابا
ذرا بولو تو شہروں کے مکاں بھی بات کرتے ہیں

ہم بڑی سی کار سے اُترے سیاست کی طرح
میرا دامن اُس کا آنچل دونوں چھوٹے ہوگئے

آنکھیں ریگستان کی سوکھی جھیلوں میں
دو دن کا مہمان سمندر آنکھوں میں

ماں دیارِ کعبہ کی مٹی میں سو کر سرفراز
میرؔ کا دیوان گھر آ کر فرشتے لے گئے

مرا یہ عہد ہے کہ آج سے میں کوئی منظر غلط نہ دیکھوں گا
میری بیٹی نے میری پلکوں کو کتنی پاکیزگی سے چوما ہے

میں نے کرنوں سے ڈھانپ لی آنکھیں
شاخ پہ پھول بے لباس رہے

کس کو گرا رہے ہو کس کو جلا رہے ہو
اے مذہبی درندو! ہر گھر خدا کا گھر ہے

اُجلے اُجلے چراغ پہنے ہوئے
رات ایک سانولی سی عورت ہے

اب غریبی محترم ہو جائے گی
دھوپ کے گملوں میں پھول آنے لگے

میرے ہونٹوں کے پھول سوکھ گئے
تم نے کیا مجھ سے بے وفائی کی

ایک رات ہے اکیلی تنہائیوں کی چھت پر
پھولوں کی چلمنوں سے جگنو چمک رہے ہیں

آپ سے مل کر بہت جی خوش ہوا
پھر ملیں گے اب اجازت دیجیے

میں کمھلایا پھول نہیں ہوں، میں مرجھایا چاند نہیں
سورج ہوں بستر سے اُٹھوں گا شام کو واپس آؤں گا

نفرت کو محبت کا اِک شعر سناتا ہوں
میں لال پسی مرچیں پلکوں سے اُٹھاتا ہوں

دن میں سورج کو پوجنے والو!
ہم کو بھی رات میں ذرا دیکھو

جہاں میں ڈوب جاتا ہوں وہیں میں جھلملاتا ہوں
میری کاغذ کی کشتی میں کئی جگنو بھی ہوتے ہیں

ارادے، حوصلے، کچھ خواب، کچھ بھولی ہوئی یادیں
غزل کے ایک دھاگے میں کئی موتی پروتے ہیں

وہ سورج کی طرح ہنستا ہوا گھر لوٹ جاتا ہے
غزل کی بارشوں میں دھوپ کے آنسو بھی ہوتے ہیں

ہوائیں، تتلیاں، جگنو، گھٹا اُڑتے ہوئے پتّے
محبت کرنے والے خوبصورت لوگ ہوتے ہیں

قدم قدم پہ لہو کے نشان کیسے ہیں
تیری زمیں تو میرے آنسوؤں نے دھوئی تھی

مسکراتی ہوئی تنہائی ہے
رات میں دھوپ نکل آئی ہے

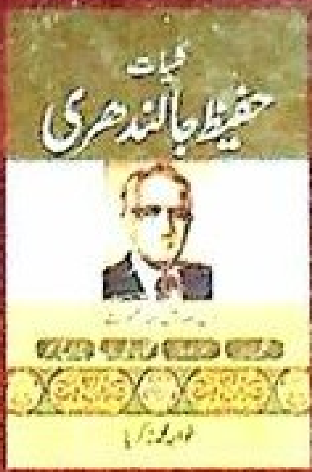
اس کے چاروں طرف سمندر ہے
دل بڑی خوشنما ریاست ہے

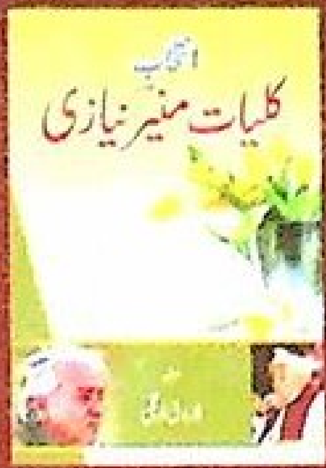
صبح سورج کے ساتھ سو لیں گے
رات بھر جاگنا عبادت ہے

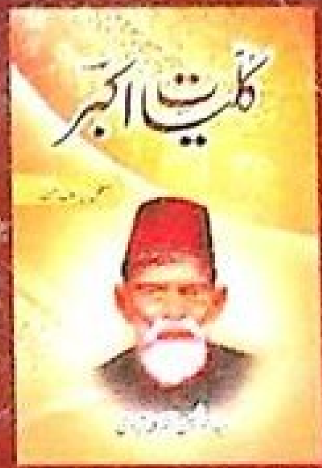
ہزاروں لفظ جو اخبار میں پتھر کے ہوتے ہیں
غزل میں آ گئے تو رات کی پلکیں بھگوتے ہیں

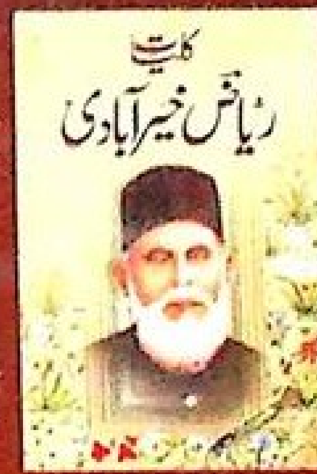
چڑھا کے پیٹھ پہ بکری کے بچّے گھومیں گے
یہ دُنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کر دے گی

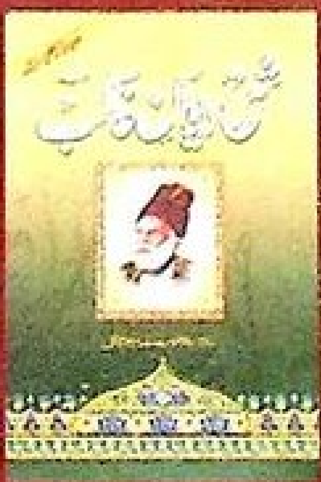
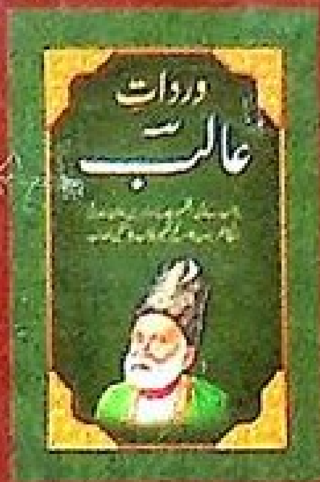
OO

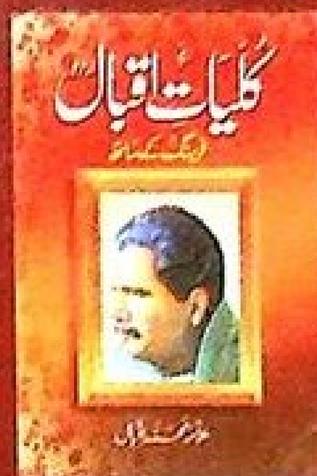


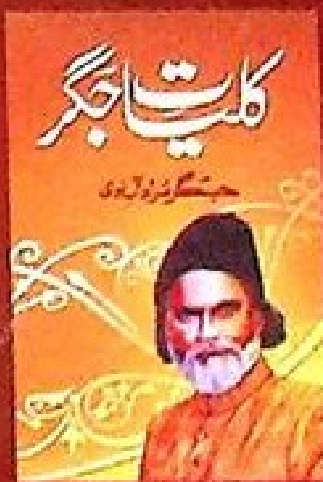


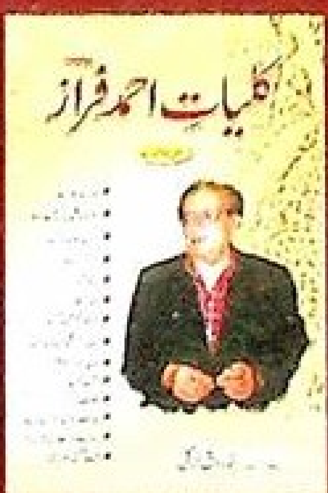


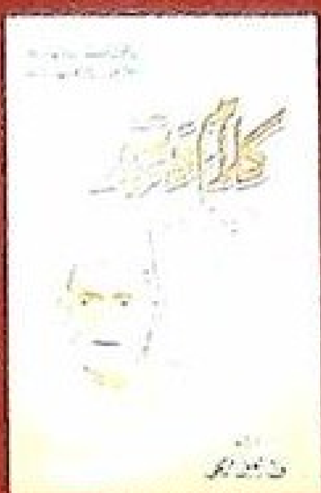
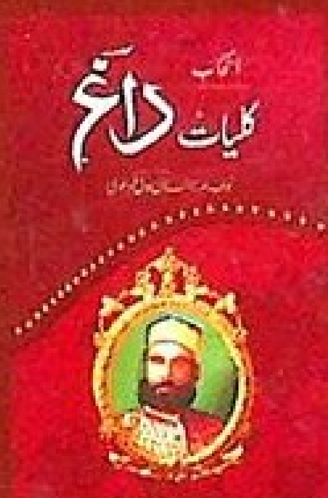


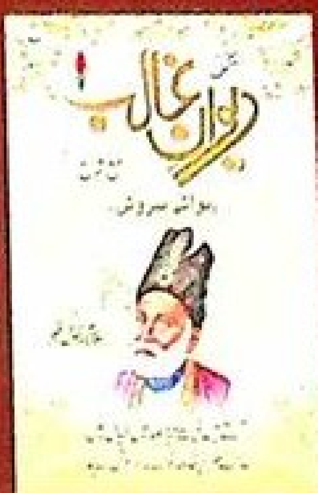



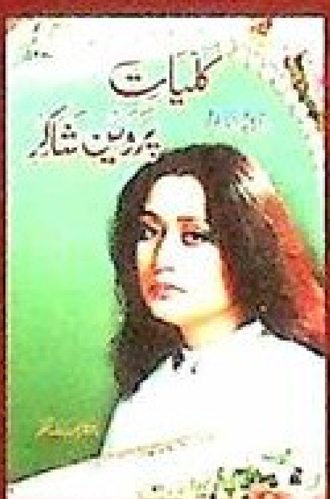


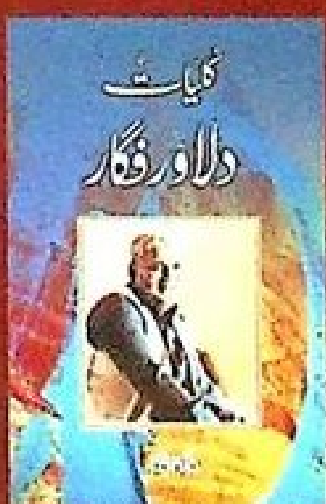


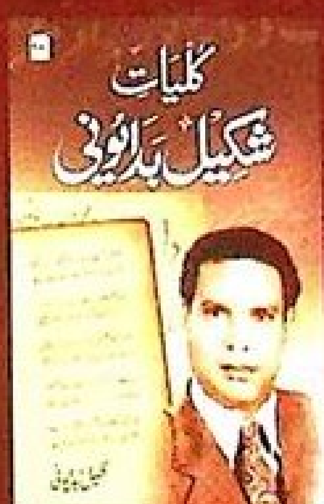


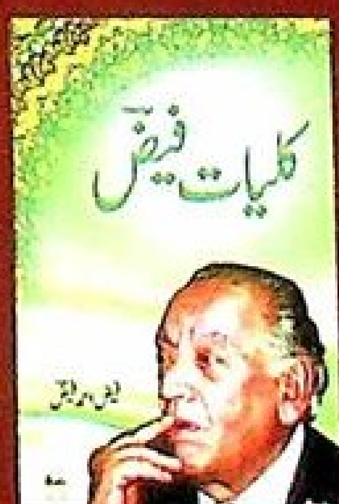













فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi-2
Phones : 011-23289786, 011-23289159 Fax: 011-23279998
E-mail : faridexport@gmail.com - Website : www.faridexports.com

Rs.350/-